ملازم و ملازمت کے شرعی احکام

مع رسالہ

عصرِ حاضر میں لیزنگ کے کاروبار کا شرعی جائزہ

مؤلف:

مفتی اقبال حسین صابری

پسند فرمودہ

حضرت مولانا مفتی سیف الدین صاحب

استاذ الحدیث و رئیس دار الافتاء جامعہ محمدیہ اسلام آباد

مکتبہ عثمانیہ

MAKTABA USMANIA

RAWALPINDI

اس کتاب میں اجارہ کے مبادیات، ملازمت کے اصول وضوابط، ملازم کی مراعات کے شرعی احکام، مختلف فنڈز کے شرعی احکام، عورت کی ملازمت کے شرعی احکام، دینی امور کی ملازمت کے شرعی احکام، ملازمت کی متفرق صورتوں کے شرعی احکام، ملازمین کے نماز، زکوۃ، وغیرہ کے مسائل اور ملازمت کے تحفظ سے متعلق احکام کو مکمل شرح وسط کیساتھ بیان کیا گیا ہے۔

ملازم وملازمت کے شرعی احکام

مع رسالہ

عصر حاضر میں لیزنگ کاروبار کا شرعی جائزہ

مؤلف

مفتی اقبال حسین صابری

پسند فرمودہ

حضرت مولانا مفتی سیف الدین صاحب مدظلہم
استاد الحدیث ورئیس دار الافتاء جامعہ محمدیہ اسلام آباد

مکتبہ عثمانیہ

اقبال مارکیٹ اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی

0333-5141413, 051-5534979

نام کتاب : ملازم وملازمت کے شرعی احکام
مع رسالہ عصر حاضر میں لیزنگ کاروبار کا شرعی جائزہ
مؤلف : مولانا مفتی محمد اقبال حسین صابری
طبع جدید : جنوری ۲۰۱۷ء
ناشر : مکتبہ عثمانیہ (کمیٹی چوک، راولپنڈی)

ملنے کے پتے:

اسلام آباد	مکتبہ فریدیہ	نزد جامعہ فریدیہ......اسلام آباد
لاہور	اسلامی کتب خانہ	فضل الٰہی مارکیٹ، چوک اردو بازار......لاہور
	مکتبہ رحمانیہ	غزنی سٹریٹ، اردو بازار......لاہور
	مکتبہ العلم	اردو بازار......لاہور
فیصل آباد	مکتبہ العارفی	نزد جامعہ امدادیہ، ستیانہ روڈ......فیصل آباد
	مکتبہ اسلامیہ	امین پور بازار، نزد اٹلس بنک......فیصل آباد
ملتان	مکتبہ حقانیہ	ٹی بی ہسپتال روڈ......ملتان
	مکتبہ امدادالعلوم	ٹی بی ہسپتال روڈ......ملتان
کراچی	ادارۃ المعارف	جامعہ دارالعلوم......کراچی
	مکتبہ عمر فاروق	نزد جامعہ فاروقیہ......کراچی
	مکتبہ لدھیانوی	نیو ٹاؤن......کراچی
پشاور	دارالاخلاص	قصہ خوانی بازار......پشاور
اکوڑہ خٹک	مکتبہ رشیدیہ	نزد جامعہ حقانیہ......اکوڑہ خٹک
مردان	مکتبہ امام محمد	پار ہوتی، نزد خیر المدارس......مردان
کوہاٹ	مکتبہ اشرفیہ	کمال پلازہ......کوہاٹ
کوئٹہ	مکتبہ رشیدیہ	سرکی روڈ......کوئٹہ
مینگورہ	عثمان بک ایجنسی	مینگورہ......سوات
صوابی	مدنی کتب خانہ	......صوابی

تقریظ

اسلام ایک عالمگیر اور ہمہ گیر دستورِ حیات ہے، یہ ہر زمانے کے تقاضوں سے مطابقت رکھتا ہے اور انسان کی مکمل رہنمائی کرتا ہے، اسلامی تعلیمات صرف عبادات تک محدود نہیں ہیں، بلکہ یہ معاملات اور معاشرت سمیت انسانی زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق واضح ہدایات اور اصول فراہم کرتا ہے، جو دنیاوآخرت میں حقیقی کامیابی کے ضامن ہیں۔

اسی طرح اسلام ہمیں ذریعہ معاش کے بارے میں بھی جائز اور ناجائز کا تصور دیتا ہے اور فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالی نے بڑی عرق ریزی سے ملازم اور ملازمت میں جائز اور ناجائز امور کی نشاندہی فرما کرامت پر احسان عظیم فرمایا ہے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ موجودہ ترقی یافتہ دور میں ملازمتوں کی نت نئی شکلیں سامنے آرہی ہیں، جن کا قدیم دور میں تصور تک نہیں تھا اور ملازمین کے حقوق وفرائض میں بہت سے ایسے امور شامل ہو گئے ہیں، جو خاص ترقی یافتہ دور ہی کی پیداوار ہیں، اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں ملازمت کی نت نئی صورتوں کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور ملازم کے حقوق وفرائض موجودہ دور کے تناظر میں دیکھے جائیں، تاکہ پیشہ ملازمت کو شرعی خطوط پر استوار کیا جا سکے۔

اللہ تعالی مفتی اقبال حسین صابری صاحب کے علم وعمل میں ترقی فرمائیں کہ انہوں نے بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ "ملازم وملازمت کے شرعی احکام" کے نام سے ایک کتاب تالیف فرمائی، جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس میں ملازم کے حقوق وفرائض اور ملازمت کی جدید صورتوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے، نیز مؤلف نے مسائل کے ساتھ معتبر کتب سے ان کے حوالہ جات درج کر کے کتاب کی افادیت دو چند بڑھا دی، بلاشبہ اس کتاب کا مطالعہ ہر خاص وعام کے لئے نہایت مفید ہوگا۔ اللہ تعالی اس کتاب کو مؤلف وناشر دونوں کے لئے صدقہ جاریہ بنائیں۔

آمین یارب العالمین

سیف الدین غفرلہ المتین

رئیس دارالافتاء جامعہ محمدیہ، اسلام آباد

۱۶/ اکتوبر ۲۰۱۷ء

فہرست مضامین

باب(۱)......اجارہ کے مبادیات

باب(۲) ملازمت کے اصول وضوابط اور ملازم کے شرعی احکام

باب (۳)......مراعات اور ان سے متعلقہ شرعی احکام

باب (۴)......ملازم کے مختلف فنڈز اور ان کے شرعی احکام

باب (۵)......عورت کی ملازمت اور اس کے شرعی احکام

باب (۶)...... دینی امور کی ملازمت کے شرعی احکام

باب (۷)......ملازمت کی متفرق صورتیں اور انکے شرعی احکام

باب (۸)......ملازمت کی جائز اور ناجائز صورتیں

باب (۹)......ملازم اور رشوت

باب (۱۰)......ملازمین کے نماز، زکوۃ، وغیرہ کے مسائل

باب (۱۱)......ملازمت کا تحفظ اور اس کے شرعی احکام

نوٹ: ضمیمہ کی فہرست اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

ضمیمہ......رسالہ

عصر حاضر میں لیزنگ کاروبار کا شرعی جائزہ

باب(۱)

اجارہ کے مبادیات

تعریف......ثبوت......ارکان......اقسام

اجارہ کی لغوی تعریف:

لغت میں اجارہ کا اطلاق عمل کے بدلے میں کسی کو کچھ عوض ادا کرنے پر ہوتا ہے۔
"اَجَرَ" باب ضرب یضرب سے آتا ہے، اس کا مضارع "یاجِرُ" آتا ہے، اس وقت اس کے معنی ہوں گے کسی کو اس کے عمل کی جزاء دینا، باب مفاعلہ سے بھی آتا ہے، اس وقت اس کے معنی ہوں گے باہم اجارہ کا معاملہ کرنا۔

اجارہ کی اصطلاحی تعریف:

احناف کے نزدیک اجارہ کی تعریف یہ ہے:

"اَلْإِجَارَةُ هِيَ بَيْعُ مَنْفَعَةٍ مَعْلُومَةٍ بِأَجْرٍ مَعْلُومٍ"۔(۱)

ترجمہ: متعین اجرت کے بدلے میں متعین منفعت کی بیع کو اجارہ کہا جاتا ہے۔

درمختار میں ہے:

"وَشَرْعًا تَمْلِيكُ نَفْعٍ بِعِوَضٍ"۔(۲)

(۱) البحر الرائق: ۷/ ۲۹۷

(۲) الدرالمختار: ۹/ ۶

شرعاً اجارہ کہا جاتا ہے عوض کے بدلے میں منفعت کا مالک بننا۔

اجارہ کا ثبوت قرآن کریم کی روشنی میں

سورۃ القصص میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ قَالَتْ إِحْدٰهُمَا يٰٓأَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ، قَالَ إِنِّيٓ أُرِيدُ أَنْ أُنكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰٓى أَن تَأْجُرَنِي ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ﴾۔(۱)

ترجمہ: ان دونوں میں سے ایک لڑکی نے کہا ابا جان! آپ ان کو نوکر رکھ لیجئے، کیونکہ اچھا نوکر وہ شخص ہے جو مضبوط ہو اور امانت دار بھی ہو (اور ان میں دونوں صفتیں ہیں، کیونکہ قوت ان کے پانی کھینچنے سے اور امانت ان کے برتاؤ کرنے سے ظاہر ہوتی ہے اس پر) وہ (بزرگ موسیٰ علیہ السلام سے) کہنے لگے کہ میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کو تمہارے ساتھ بیاہ دوں اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو (اور اس نوکری کا بدلہ وہی نکاح ہے، حاصل یہ کہ آٹھ سال کی خدمت اس نکاح کا مہر ہے)

تشریح: قرآن کریم کی ان آیات سے اجارہ کے جواز پر استدلال اس طرح کیا جاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بکریوں کے چرانے کا معاملہ اجرت معلومہ کے ساتھ کیا، اور آٹھ سال کی خدمت وملازمت کو نکاح کا مہر قرار دیا گیا۔

اجارہ کا ثبوت احادیث مبارکہ سے

(۱) ”عن عائشه رضی الله عنها فی خبر الهجرة قالت واستاجر

(۱) سورۃ القصص، آیت: ۲۶، ۲۷

النبی ﷺ و أبوبکر رجلا من بنی الذھل ھادیا خریتا ،وھو علی دین کفار قریش فدفعا إلیہ راحلتیھما ووعداہ غار ثور بعد ثلاث لیال فأتاھما براحلتیھما صبح ثلاث"۔(۱)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں ہجرت کے واقعہ میں کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قبیلہ ذہل کے ایک شخص کو جو کہ ماہر رہبر تھا اجرت پر لیا تھا اور وہ شخص کفار قریش کے دین پر تھا، ان دونوں حضرات نے اپنی سواریاں اس کے حوالہ کردی تھیں اور دونوں نے اس سے تین راتوں کے بعد غار ثور میں ملنے کا وعدہ کیا تھا وہ آدمی تین راتوں کے بعد صبح سویرے آیا۔

فائدہ: اس حدیث سے بھی اجارہ کا جواز ثابت ہوتا ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے راستہ معلوم کرنے کے لئے ایک ماہر رہبر کو اجرت پر لیا تھا، تاکہ وہ مدینہ طیبہ تک کا راستہ بتائے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ کافر کو ملازم رکھنا درست اور جائز ہے۔

(۲)"عن انس ابن مالکؓ إن النبی ﷺ احتجم واعطی الحجام أجرہ"۔(۲)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ بیان فرماتے ہیں کہ بے شک نبی کریم ﷺ نے پچھنے لگوائے اور آپ ﷺ نے حجام کو اس کی اجرت عنایت فرمائی۔

نبی کریم ﷺ کا اجرت دینے سے اجرت کا جواز بالکل واضح ہے۔

(۳)"عن أبی ھریرۃؓ عن النبی ﷺ قال: قال اللہ تعالیٰ: ثلاثۃ أنا خصمھم یوم القیامۃ ،رجل أعطیٰ بی ثم غدر، ورجل باع

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاجارہ: ۱/ ۳۰۱ ۔حدیث نمبر: ۲۱۶۴

(۲) سنن ابن ماجہ،ابواب التجارات ،باب کسب الحجام : ۲ / ۱۰

حرا فأكل ثمنه، ورجل استاجر أجيرا فاستوفیٰ منه ولم يعطه أجره"۔(۱)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن میں تین آدمیوں کا دشمن بنوں گا، ایک وہ شخص جو میرا نام لے کر عہد کرے اور پھر توڑ دے، دوسرا وہ شخص جس نے کسی آزاد شخص کو فروخت کر کے اس کی قیمت کھائی، اور ایک وہ شخص جس نے کسی مزدور کو اجرت پر لیا، اس سے کام تو پورا لیا، لیکن اس کی اجرت نہ دی۔"

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مزدور کو کام کی تکمیل پر اجرت ضرور ادا کرنی چاہئے اور ادا نہ کرنے والے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے، اس سے اجارہ کے جواز پر دلیل بالکل واضح ہے، اگر اجارہ جائز نہ ہوتا، تو اللہ تعالیٰ کبھی بھی اجرت نہ دینے پر ناراضگی کا اظہار نہ فرماتے۔

(٤) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِي صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا رَعَى الغَنَمَ، فَقَالَ أَصْحَابُهُ: وَ أَنْتَ؟ فَقَالَ: نَعَمْ، كُنْتُ أَرْعَاهَا عَلَى قَرَارِيطَ لِأَهْلِ مَكَّةَ۔(۲)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی نبی ایسا نہیں ہوا کہ جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں، صحابہؓ نے عرض کیا کہ آپ نے بھی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں میں بھی اہل مکہ کی بکریاں چند قیراط پر چرایا کرتا تھا۔

مذکورہ حدیث سے بھی اجارہ کا جواز ثابت ہوتا ہے، اگر اجارہ جائز نہ ہوتا تو حضور

---

(۱)صحيح البخاری، کتاب البيوع، باب اثم من باع حرا۔

(۲)صحيح بخاری، کتاب الاجارة، باب رعی الغنم علی قيراط، رقم:(۲۲٦۲)

ﷺ کبھی بھی قیراط کے بدلے بکریاں نہ چراتے۔

اجماع سے اجارہ کا ثبوت

"قال الكاساني: وأما الإجماع فإن الأمة أجمعت على ذلك قبل وجود الأصم، حيث يعقدون عقد الإجارة من زمن الصحابه إلى يومنا هذا من غير نكير، فلا يعباء بخلافه، إذ هو خلاف الإجماع، وبه تبين أن القياس متروك، لأن الله تعالىٰ إنما شرع العقود لحوائج العباد، وحاجتهم إلى الإجارة ماسة"۔(۱)

ترجمہ: علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں کہ ابوبکر الاصم سے پہلے پوری امت کا اس بات پر اجماع تھا کہ عقد اجارہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ سے لے کر آج تک بغیر کسی نکیر کے چلا آرہا ہے، لہٰذا اس اجماع سے اختلاف کرنے والے کا کوئی اعتبار نہیں، اسی سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قیاس اس جگہ متروک ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے حوائج کی وجہ سے عقود کو مشروع کر رکھا ہے اور اجارہ کی حاجت اور ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔

علامہ ابن رشد مالکیؒ فرماتے ہیں:

"إن الإجاره عند جميع فقهاء الأمصار والصدر الأول"۔(۲)

علامہ ابن رشد فرماتے ہیں کہ اجارہ صدر اول اور تمام علاقوں کے فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔

(۱) بدائع الصنائع: ٤/ ١٦

(۲) بداية المجتهد ونهاية المقتصد، كتاب الاجارات: ١/ ١٨١ ـ طبع بيروت

اجارہ کا رکن

اجارہ کا رکن ایجاب وقبول ہے اور یہ ان الفاظ کے ساتھ ادا ہوتا ہے جو اس اجارہ پر دلالت کرتے ہیں، مثلاً "الاجارہ"، یالفظ" استئجار' یالفظ " الاکتراء " یالفظ" اکراء " جیسے الفاظ بولے جائیں، تو اجارہ مکمل سمجھا جائے گا۔

یہ تو وہ الفاظ ہیں جو کلام عرب میں مستعمل ہیں، ہمارے عرف ورواج میں ایسے تمام الفاظ رکن اجارہ میں داخل سمجھے جائیں گے، جن کے ذریعہ سے اجارہ کا انعقاد سمجھا جاتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص کسی سے کہے کہ میرے اور تمہارے درمیان کرایہ داری کا معاملہ ہے، یا میرے اور تمہارے درمیان اجرت کا لین دین ہے، یا تم میرے ملازم ہو، یا میں تمہیں اجرت ادا کروں گا، وغیرہ۔ اگر اس طرح کے کسی بھی لفظ سے اجارہ کیا جائے جو کہ اجارہ پر دلالت کرے، تو وہ رکن اجارہ میں داخل سمجھا جائے گا۔

چنانچہ علامہ کاسانیؒ بدائع الصنائع میں فرماتے ہیں:

"أما ركنها فالإيجاب والقبول، وذلك بلفظ دال عليها، وهو لفظ الإجاره والاستيجار والاكتراء والإكراء، فإذا وجد ذلك، فقد تم الركن"۔(۱)

ترجمہ: اجارہ کا رکن ایجاب وقبول ہے اور یہ ایجاب قبول ان الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے جو کہ ایجاب وقبول پر دلالت کریں۔ اور وہ الفاظ "الاجارہ، الاستیجار، الاکتراء، الاکراء ہیں، پس جب یہ پائیں جائیں، تو رکن اجارہ مکمل ہوگیا۔

"وذكر بعض المشائخ أن الإجاره نوعان: إجارة على المنافع، وإجارة على الأعمال"۔(۲)

(۱) بدائع الصنائع: ۴/ ۱۷

(۲) بدائع الصنائع: ۱/ ۱۶

بعض مشائخ نے ذکر کیا ہے کہ اجارہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) اجارۃ علی المنافع (۲) اجارہ علی العمل۔

مزدوری یا ملازمت کا تعلق اجارہ کی دوسری قسم اجارہ علی العمل کے ساتھ ہے۔

اجیر و مزدور کی اقسام:

فقہاء نے اجیر، ملازم یا مزدور کی پھر دو قسمیں بیان کی ہیں:

(۱) اجیر خاص

(۲) اجیر عام

اجیر عام کی تعریف:

علامہ علاء الدین حصکفیؒ لکھتے ہیں:

"الأجراء علىٰ ضربين: مشترك وخاص، فالأول من يعمل لا لواحد كالخياط ونحوه، أو يعمل له عملا غير موقت"۔ (۱)

اجیر عام وہ ہے جو کسی ایک کے لئے کام نہ کرے، جیسا کہ درزی وغیرہ، یا غیر موقت کام کرے۔

اجیر عام کا حکم:

اجیر عام کا حکم یہ ہے کہ اجیر عام جب کام مکمل کرے گا، تو یہ اجرت کا مستحق ہوگا۔

اجیر خاص کی تعریف:

علامہ علاء الدین حصکفیؒ لکھتے ہیں:

---

(۱) الدر المختار: ۹/ ۱۰۱

”والثاني هو الأجير الخاص ، ويسمیٰ أجير وحد ، وهو من يعمل لواحد عملا موقتا بالتخصيص ، ويستحق الأجر بتسليم نفسه في المدة ، وإن لم يعمل ، كمن استؤجر شهرا للخدمة“۔(۱)

اجیرِ خاص وہ (مزدور و ملازم) ہے جو کسی ایک کے لئے کام کرے اور اس کام کا وقت بھی مقرر ہو، تو یہ اپنے آپ کو حوالہ کرنے سے اجرت کا مستحق ہو جائے گا، چاہے کام کرے، یا نہ کرے۔

اجیرِ خاص کی مروجہ صورتیں:

۱)......سرکاری ملازمین۔

۲)......پرائیویٹ اداروں، فیکٹریوں، کارخانوں کے ملازمین۔

۳)......تعلیمی اداروں کے اساتذہ۔

۴)......تعلیمی اداروں کا دیگر عملہ۔

۵)......مختلف دکانوں پر کام کرنے والے ملازمین۔

۶)......تعمیراتی کام کرنے والے مزدور۔

۷)......بنگلوں عمارتوں محلوں وغیرہ میں رکھے گئے چوکیدار۔

۸)......عام گھریلو ملازمین۔

(۱) الدر المختار: ۱۱۷/۹

باب (۲)

ملازمت کے اصول وضوابط

اور ملازم کے شرعی احکام

اجیر خاص کی مروجہ صورتیں:

۱)......سرکاری ملازمین۔
۲)......پرائیویٹ اداروں، فیکٹریوں، کارخانوں کے ملازمین۔
۳)......تعلیمی اداروں کے اساتذہ۔
۴)......تعلیمی اداروں کا دیگر عملہ۔
۵)......مختلف دکانوں پر کام کرنے والے ملازمین۔
۶)......تعمیراتی کام کرنے والے مزدور۔
۷)......بنگلوں عمارتوں محلوں وغیرہ میں رکھے گئے چوکیدار۔
۸)......عام گھریلو ملازمین۔

مزدور یا ملازم اس کا تعلق اجیر خاص کے ساتھ ہے، یہاں ہم سب سے پہلے اجیر خاص کے متعلق چند ضروری ضابطے بیان کریں گے، اس کے بعد انشاء اللہ تفصیل سے جائز اور ناجائز ملازمتوں، اوران کے متعلق مسائل کو بیان کریں گے۔

ضابطہ نمبر (۱)

ملازم ملازمت کے اوقات میں کوئی دوسرا کام نہیں کرسکتا

اجیر خاص (ملازم) ملازمت کے اوقات میں ملازمت کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں کرسکتا، مثلاً زید کو کسی نے ملازم رکھ لیا، ملازمت کا وقت اور اس کی تنخواہ مقرر ہوگئی، اب زید کے لئے لازمی ہے کہ وہ ملازمت کے وقت دوران ڈیوٹی اور کوئی کام انجام نہ دے، نہ ہی یہ وقت فضول ضائع کرے، بلکہ جو کام اس کے ذمے ہے، اس کو پورا ادا کرے، اس لئے کہ یہ وقت اب زید نے اس شخص کے ہاتھ فروخت کردیا ہے، اس میں اور کوئی کام کرنا جائز نہیں ہے، ادارہ کی اجازت کے بغیر ادارہ کے کاموں کے علاوہ کوئی اور کام نہ کرے اور نہ کسی دوسرے ادارہ کا کام کرے۔

ملازمت کے اوقات میں دفتر کے کام کو بہت دیانتداری سے کرنے کی ضرورت ہے، افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس وقت ہمارے ہاں کام چوری ایک وبا کی صورت اختیار کرچکی ہے، جس کی وجہ سے ہم نہ صرف دنیاوی اعتبار سے زوال کا شکار ہیں، بلکہ یہ عمل آخرت کی تباہی کا سبب بن رہا ہے، اس پر سنجیدگی سے غور کرنے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

سرکاری ڈیوٹی صحیح ادا نہ کرنا قومی وملی جرم ہے:

آپ کے مسائل اور انکا حل میں ہے:

سوال: زید کا بحیثیت ورکس شاپ اٹینڈنٹ کے تقرر کیا جاتا ہے، لیکن وہ اپنے فرائض منصبی قطعی طور پر انجام نہیں دیتا، لیکن حکومت سے ماہانہ تنخواہ وصول کرتا ہے، کیا اس کی ماہانہ تنخواہ شرعی حدود کے مطابق جائز ہے؟

جواب: جس کام کیلئے کسی کا تقرر کیا گیا ہے، اگر وہ اس کام کو ٹھیک انجام

دے گا تو تنخواہ حلال ہوگی، ورنہ نہیں، جو سرکاری ملازمین اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر ادا نہیں کرتے، تو وہ خدا کے بھی خائن ہیں اور قوم کے بھی خائن ہیں اور ان کی تنخواہ شرعاً حلال نہیں۔ دنیا میں اس خیانت کا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑتا ہے کہ اچھی آمدنی، اچھی رہائش اور اچھی خاصی آسائش اور آسودگی کے باوجود ان کا سکون غارت اور رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے، طاعت وعبادت کی توفیق سلب ہو جاتی ہے اور آخرت کا عذاب مرنے کے بعد سامنے آئے گا، اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھیں، بہرحال! اپنی ڈیوٹی ٹھیک طور پر بجا نہ لانا ایک ایسا دینی، اخلاقی اور قومی وملی جرم ہے کہ آدمی اس گناہ کی معافی بھی نہیں مانگ سکتا۔(۱)

ملازمت کے اوقات میں ڈنڈی مارنا:

مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''ایک شخص کسی محکمے میں، کسی دفتر میں آٹھ گھنٹے کا ملازم ہے، تو گویا اس نے یہ آٹھ گھنٹے اس محکمے کے ہاتھ فروخت کر دیئے ہیں، اور یہ معاہدہ کر لیا ہے کہ میں آٹھ گھنٹے آپ کے پاس کام کروں گا اور اس کے عوض اس کو اجرت اور تنخواہ ملے گی۔ اب اگر وہ اجرت تو پوری لیتا ہے، لیکن اس آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی میں کمی کر لیتا ہے، اور اس میں سے کچھ وقت اپنے ذاتی کاموں میں صرف کر لیتا ہے، تو اس کا یہ عمل بھی ''تطفیف'' میں داخل ہے، حرام ہے، گناہ کبیرہ ہے، یہ بھی اسی طرح گناہ گار ہے جس طرح کم ناپنے اور کم تولنے والا گناہ گار ہوتا ہے، اس لئے کہ اس نے اگر آٹھ گھنٹے کے بجائے سات گھنٹے کام کیا، تو ایک

---

(۱) آپ کے مسائل اور انکا حل: ۲۹۱/۸

گھنٹے کی ڈیوٹی ماردی، گویا کہ اجرت کے وقت اپنا حق اجرت تو پورا لے رہا ہے اور جب دوسروں کے حق دینے کا وقت آیا، تو کم دے رہا ہے، لہٰذا تنخواہ کا وہ حصہ حرام ہوگا، جو اس وقت کے بدلے میں ہوگا جو اس نے اپنے ذاتی کاموں میں صرف کیا، ایک ایک منٹ کا حساب ہوگا۔

کسی زمانے میں دفتروں میں ذاتی کام چوری چھپے ہوا کرتے تھے، مگر آج کل دفتروں کا یہ حال ہے کہ ذاتی کام چوری چھپے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ کھلم کھلا، علانیہ، ڈنکے کی چوٹ پر کیا جاتا ہے، اپنے مطالبات پیش کرنے کیلئے ہر وقت تیار ہیں کہ تنخواہیں بڑھاؤ، الاونس بڑھاؤ، فلاں فلاں مراعات ہمیں دو، اور اس مقصد کے لئے احتجاج کرنے، جلسے جلوس کرنے اور نعرے لگانے کے لئے، ہڑتال کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں، لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارے ذمے کیا حقوق عائد ہو رہے ہیں؟ ہم ان کو ادا کر رہے ہیں یا نہیں؟ ہم نے آٹھ گھنٹے کی ملازمت اختیار کی تھی، ان آٹھ گھنٹوں کو کتنی دیانت اور امانت کے ساتھ خرچ کیا، اس کی طرف بالکل دھیان نہیں جاتا، یاد رکھو! ایسے ہی لوگوں کے لئے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے لئے درد ناک عذاب ہے، جو دوسروں کے حقوق میں کمی کرتے ہیں، اور جب دوسروں سے حق وصول کرنے کا وقت آتا ہے، تو اس وقت پورا پورا لیتے ہیں۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک ایک منٹ کا حساب ہوگا، اس میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی''۔(۱)

---

(۱) اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۲٤٦/۱

ضابطہ نمبر (۲)

اگر مالک ملازم سے کام نہ لے تو بھی ملازم تنخواہ کا حقدار ہوگا

اگر مالک اس ملازم سے کام نہ لے، بلکہ ویسے ہی اس کو بٹھائے رکھے، تب بھی ملازم تنخواہ کا حقدار ہوگا، اور مالک اس کو پوری پوری تنخواہ دے گا، مالک اگر اس ملازم سے کام نہیں لیتا، تو اس میں ملازم کی کوئی غلطی نہیں ہے، اس کو تنخواہ پوری ملے گی۔

علامہ ابن نجیم حنفیؒ لکھتے ہیں:

"الأجير الخاص يستحق الأجر بتسليم نفسه في المدة عمل أو لم يعمل"۔(۱)

اجیر خاص اجرت کا مستحق ہوگا، جب وہ اپنے آپ کو حوالے کر دے، چاہے کام کرے، یا نہ کرے۔

لیکن اگر کوئی عذر پیش آ گیا اور ملازم ملازمت پر نہ جا سکا، مثلاً بارش ہوگئی، یا ملازم بیمار ہوگیا، تو مالک کو اختیار ہے کہ جتنے دن عذر کی وجہ سے چھٹی کی ہے، اتنے دنوں کی تنخواہ کاٹ لے۔ البتہ بعض اداروں میں اور دکانوں میں اجارہ کے معاہدہ میں دونوں اطراف سے یہ بات طے کی جاتی ہے کہ ملازم یا مزدور کو اتنے ایام کی رخصت علالت مع تنخواہ اور اتنے ایام کی رخصت اتفاقیہ مع تنخواہ دی جائے گی، اگر یہ بات معاہدہ میں طے کر لی گئی ہو، تو پھر عذر ہونے کے باوجود بھی معینہ مدت تک رخصت پر بھی تنخواہ ملے گی۔

ضابطہ نمبر (۳)

ملازم اس ملازمت کے اوقات میں اس کے کام کے علاوہ جو اس کے ذمے لازم ہے

(۱) البحر الرائق، كتاب الاجارة، باب ضمان الأجير: (۸/۲۹)

اور کوئی کام نہیں کرسکتا، مثلاً زید پی ٹی سی ایل کمپنی میں ملازم ہے اور اس کی ڈیوٹی روزانہ آٹھ گھنٹے ہے، تو ان آٹھ گھنٹوں میں وہ صرف اس دفتر یا کمپنی کا کام کرسکتا ہے، اس کے علاوہ اپنا ذاتی یا کسی اور کا کام نہیں کرسکتا۔

اگر اس کام کے علاوہ مزدوری پر اور کوئی کام کرے، تو جتنا وقت دوسرا کام کیا ہے، اتنے وقت کی تنخواہ اس کے لئے حلال نہیں ہے، اتنے وقت کی تنخواہ محکمے والے کم کرسکتے ہیں، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ اتنے وقت کی تنخواہ محکمے والوں کو واپس کردے۔

"قال في الدر المختار: وليس للخاص أن يعمل لغيره، ولو عمل نقص من أجرته بقدر ما عمل"۔(۱)

امداد الفتاویٰ میں ہے:

سوال: (نمبر ۳۲۰) دفتر کے وقت میں ذاتی خط وغیرہ لکھنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب: نہیں (یعنی جائز نہیں ہے)(۲)

ڈیوٹی کے دوران دوسرے کام کرنے کا حکم:

فتاویٰ عباد الرحمن میں ہے:

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میں ایک اسکول ٹیچر ہوں، صبح کی شفٹ میں گورنمنٹ میں پڑھاتا ہوں، شام کی شفٹ میں پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتا ہوں، صبح کی شفٹ کا ٹائم ۷:۴۰ سے ۱۲:۲۰ ہے لیکن چھٹی کبھی ۱۲:۱۰ کبھی ۱۲:۰۵ کبھی ۱۲:۲۰ تک ہوجاتی ہے، مجھے دوسرے سکول جانے کے لئے ۱۲:۰۰ بجے جانا پڑتا ہے، اس لئے میں نے ہیڈ ماسٹر سے بات کی، نہ تو کوئی دباؤ ڈالا اور نہ کوئی لالچ دی، اس نے مجھے ۱۵، ۲۰ منٹ

---

(۱) الدر المختار: ۹/۱۱۹

(۲) امداد الفتاویٰ: ۳/۳۵۵

پہلے جانے کی اجازت دے دی۔ پھر ٹائم ٹیبل ایسا بنایا کہ میرے پیریڈ ۱۲ بجے تک پورے ہو جاتے ہیں، یعنی پڑھانے کی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے، لیکن ڈیوٹی کے اعتبار سے ۱۵، ۲۰ منٹ جلدی چلا جاتا ہوں، قرآن وحدیث میں اس کی کیا حیثیت ہے؟ ۱۵، ۲۰ منٹ جلدی جانے سے کیا تنخواہ ناجائز ہو جاتی ہے؟ یا ہیڈ ماسٹر کی اجازت سے جائز ہو جاتی ہے؟ شریعت کے مطابق بتائیں کہ ۱۵، ۲۰ منٹ پہلے اجازت سے جانا جائز ہے یا نوکری چھوڑ دینا بہتر ہے؟

جواب: حکومت کی ملازمت میں عرفاً وقت اور کام دونوں کا معاہدہ ہوتا ہے اور حکومت جو تنخواہ آپ کو دیتی ہے، وہ صرف وقت کی نہیں، بلکہ طے شدہ وقت اسکول میں گزارنے کا بھی معاوضہ ہے، اور ہیڈ ماسٹر کو اتنا اختیار نہیں کہ وہ روزانہ کسی کو وقت سے پہلے جانے کی اجازت دیدے، لہٰذا آپ کے لئے روزانہ وقت مقررہ سے پہلے جانا جائز نہیں اور اگر آپ روزانہ وقت سے پہلے جائیں گے، تو اسی قدر تنخواہ شرعاً متاثر ہوگی، یعنی آپ کے لئے حلال وطیب نہ ہوگی، کوتاہی کے بقدر تنخواہ کی رقم محکمہ کو واپس کرنا ضروری ہوگا۔(۱)

کیا اجیر خاص کام کے اوقات میں نوافل پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

چونکہ اللہ تعالیٰ نے نفلی عبادات کا ثواب بہت زیادہ لکھا ہے، اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اجیر خاص اوقات ملازمت میں نفلی عبادت کر سکتا ہے، یا نہیں؟

علامہ شامیؒ نے فتاویٰ شامی میں فرمایا ہے کہ اجیر خاص کے لئے کام کرنے کے اوقات میں نفلی عبادت کرنا جائز نہیں ہے، البتہ اوقات کار میں فرائض اور سنن مؤکدہ ادا کرے گا، علامہ شامیؒ ردالمحتار میں فرماتے ہیں:

---

(۱) فتاویٰ عباد الرحمن: ۴/ ۳۸۱

"وليس للخاص من أن يعمل لغيره ، بل ولا أن يصلي النافلة ،

قال في التاترخانيه ، وفي فتاوى الفضلي : إذا استاجر رجلا يوما

يعمل كذا، فعليه أن يعمل ذلك اليوم إلىٰ تمام المدة ، ولا

يشتغل بشيء آخر سوى المكتوبه ، وفي فتاوىٰ سمرقند : وقد

قال بعض مشائخنا أن يودى السنة أيضا ، واتفقوا أنه لا يؤدى

نفلا ، وعليه الفتوىٰ "۔(۱)

ترجمہ: اور اجیر خاص کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے کا کام کرے، بلکہ اس کے لئے نفلی نماز پڑھنا بھی جائز نہیں ہے، "تاترخانیہ" میں فرمایا کہ فتاویٰ فضلی میں لکھا ہے کہ جب کوئی شخص کسی آدمی کو ایک دن کام کے لئے اجرت پر لے، تو اجیر کے لئے لازم ہے کہ وہ کام کو طے شدہ مدت کے اندر مکمل کردے اور فرض نمازوں کے علاوہ کسی اور کام میں مشغول نہ ہو، اور فتاویٰ سمرقند میں یہ مسئلہ موجود ہے کہ بعض مشائخ نے فرمایا کہ اس کو سنن کی ادائیگی کی اجازت ہے، اور تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ اجیر خاص نوافل ادا نہیں کرسکتا اور اسی پر فتویٰ ہے۔

اس عبارت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اجیر خاص کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے کام کو متعینہ مدت میں انجام دے، اور کسی دوسرے کام میں مشغول نہ ہو، البتہ فرائض اور سنن ادا کرسکتا ہے، لیکن اس کے لئے نفلی نماز مفتیٰ بہ قول کے مطابق جائز نہیں ہے۔

مسئلہ: ملازم کے لئے نماز پنجگانہ مع سنتوں کے، جمعہ، عیدین اور ان کے مقدمات جیسے غسل، استنجاء وضو اور مسجد میں حاضری وغیرہ سارے کام کرنا ملازمت کے دوران ان کی

---

(۱) فتاویٰ شامی: ۱۱۸/۹

اجازت ہے، ان سے روکنا جائز نہیں ہے، ان سے روکنے کے لئے شرط لگائے تو اس شرط کو ماننا جائز نہیں، کیونکہ آقا کا ہر حکم جو حکم الٰہی کا مقابل ہو اس کو ماننا جائز نہیں ہے۔(۱)

مسئلہ: اگر جامع مسجد ملازمت کی جگہ سے دور ہو، تو نہ آقا کو روکنے کا حق ہے، نہ ملازم کے لئے جمعہ باجماعت ترک کرنا جائز ہے، ہاں آمد رفت و شغل نماز کی مدت کی تنخواہ کاٹی جاسکتی ہے۔(۲)

البتہ اگر دفتر کا مطلوبہ کام ملازم ختم کر چکا ہے اور مزید کام نہ ہو، کام نہ ہونے کی وجہ سے فارغ ہو، تو اس فارغ وقت میں ذکر و تلاوت کرنا بالکل جائز ہے، یا اور کسی اچھے کام میں بھی اس وقت کو خرچ کر سکتے ہیں۔

اجیر خاص سے متعلق عبارات کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اسے اوقات کار میں نفلی نماز کی بھی اجازت نہیں ہے، حالانکہ نوافل عظیم الشان عبادت ہے اس کے باوجود اجیر خاص کو اوقات کار میں اس سے منع فرمایا ہے، تو پھر اجیر کے لئے دوسرے کام کرنے اور وقت پورا نہ دینے کی تو لامحالہ اجازت نہ ہوگی، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ملازم حضرات وقت پورا نہیں دیتے، یا کسی اور کام میں مشغول ہو جاتے ہیں، یہ سراسر ناجائز اور غلط ہے۔

بہت سارے ملازمت پیشہ حضرات کام کے اوقات میں دفتر یا ادارہ میں تو رہتے ہیں، لیکن جو کام ان کے سپرد کیا گیا ہے، اسے انجام نہیں دیتے، بلکہ ادھر ادھر وقت ضائع کرتے ہیں، یا باتوں اور گپ شپ میں لگے رہتے ہیں، یہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔

دفتری اوقات میں نیک کام کرنا:

بعض سرکاری ملازمین مثلاً اساتذہ کلرک وغیرہ ڈیوٹی کے اوقات کے دوران جبکہ کوئی وقفہ بھی نہیں ہوتا، اپنے کام کو چھوڑ کر ذکر تلاوت، وغیرہ میں مصروف ہوتے ہیں، جنہے

(۱)عطر ھدایہ:(ص:۲۵٤)

(۲)عطر ھدایہ:(ص:۲۵۵)

رمضان المبارک میں ڈیوٹی کے بجائے تلاوت کرتے رہتے ہیں اور اس دوران کوئی کام نہیں کرتے، جس کی وجہ عموماً سکول کے بچوں کا بھی وقت ضائع ہوتا ہے اور دفتر کا نقصان بھی ہوتا ہے، ایسا کرنا ملازمین کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے، چنانچہ مولانا یوسف لدھیانویؒ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''سرکاری ملازمین ہوں یا نجی ملازم، ان کے اوقات کار ان کے اپنے نہیں، بلکہ جس ادارے کے وہ ملازم ہیں اس نے تنخواہ کے عوض ان اوقات کو ان سے خرید لیا ہے، ان کے وہ اوقات اس ادارے کی اور قوم کی امانت ہیں، اگر وہ ان اوقات کو اس کام پر صرف کرتے ہیں جو ان کے سپرد کیا گیا ہے، تو امانت کا حق ادا کرتے ہیں، اور ان کی تنخواہ ان کے لئے حلال ہے اور اگر ان اوقات میں کوئی دوسرا کام کرتے ہیں (مثلاً تلاوت) یا کوئی کام نہیں کرتے، بلکہ گپ شپ میں گزار دیتے ہیں، تو وہ امانت میں خیانت کرتے ہیں اور ان کی تنخواہ ان کے لئے حلال نہیں۔

البتہ اگر دفتر کا کام نمٹا چکے ہیں، اور وہ کام نہ ہونے کی وجہ سے فارغ بیٹھے ہوں، تو اس وقت تلاوت کرنا جائز ہے، اسی طرح کسی اور اچھے کام میں اس وقت کو صرف کرنا بھی صحیح ہے۔

ہمارا ملازم طبقہ اس معاملہ میں بہت کوتاہی کرتا ہے، دیانت وامانت کے ساتھ کام کے وقت کام کرنے کا تصور ہی جاتا رہا، یہ حضرات عوام کے نوکر ہیں، ملازم ہیں، سرکاری خزانے میں عوام کی کمائی سے جمع ہونے والی رقوم سے تنخواہ پاتے ہیں، لیکن کام چوری کا یہ عالم ہے کہ عوام دفتروں کے بار بار چکر لگاتے ہیں اور نا کام واپس جاتے ہیں، اور اگر رشوت یا سفارش چل جائے، تو کام فوراً

ہو جاتا ہے، گویا یہی حضرات سرکار کے (اور سرکاری کی وساطت سے عوام کے) ملازم نہیں، بلکہ رشوت وسفارش کے ملازم ہیں، انصاف کیا جائے کہ ایسے ملازمین کی تنخواہ ان کے لئے کیسے حلال ہوسکتی ہے؟ اگر ان کو دل سے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس ہو اور انہیں معلوم ہو کہ کل قیامت کے دن ان کو اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے، تو دفتری کام کو دیانت وامانت کے ساتھ انجام دیا کریں، اور عوام ان کے طرز عمل سے پریشان نہ ہوا کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں امانت ودیانت کی دولت سے بہرہ ور فرمائیں۔(۱)

ڈیوٹی کے ٹائم ڈیوٹی چھوڑ کر جماعت میں شریک ہونے کا حکم:

اگر ملازمت یا ڈیوٹی کی مجبوری کی وجہ سے نماز با جماعت ادا نہ کرسکتا ہو، مثلاً مالک یا محکمے کا افسر ڈیوٹی کے وقت جانے نہ دیتا ہو، تو کیا اس کی وجہ سے ملازمت کا چھوڑنا لازم ہے؟

ایسی صورت میں ملازمت کا چھوڑنا لازم نہیں ہے، البتہ ملازم کو چاہئے کہ محکمہ کے ذمہ دار افراد کو اس کی طرف توجہ دلائیں کہ وہ نماز کے وقت میں کام سے وقفہ دے دیا کرے، یا پھر درخواست دی جائے کہ وقفہ جو کھانے کا ملتا ہے، وہ اسی نماز کے وقت دے دیا کرے، اگر ایسا نہ ہوسکتا ہو، تو بہتر ہے کہ کوئی دوسری ملازمت تلاش کی جائے، ایسی ملازمت کو چھوڑ دینا بہتر ہے، لیکن اگر اس کے علاوہ تلاش کرنے کے باجود اور ملازمت نہیں ملتی، تو اس صورت میں جماعت کی نماز چھوڑنے کا گناہ نہ ہوگا، بلکہ اگر ملازم کی نیت ہو کہ میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھوں گا، لیکن عذر کی وجہ سے نہیں پڑھ سکا، تو اس کو جماعت کا ثواب مل جائے گا، کیونکہ فقہاء کرام نے عذر کی بناء پر جماعت کی نماز چھوڑنے کی اجازت دی:

"قال في الهنديه : وتسقط الجماعة بالأعذار ......أو كان إذا

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۶/۲۶۱

خرج یخاف أن یحبسه غریمه فی الدین"۔ (۱)

اور جماعت کی نماز ساقط ہو جاتی ہے عذر کی وجہ سے، یا جب وہ باہر نکلے تو اس کا قرض خواہ اس کو روک لے گا قرض میں، تو اس عذر کی وجہ سے جماعت کی نماز کا چھوڑنا جائز ہے۔

"قال فی الشامیه : لکن فی نور الإیضاح : وإذا انقطع عن الجماعة لعذر من أعذارها و کانت نیته حضورها ولو لا العذر یحصل له ثوابها "۔(۲)

ملازم کا اپنی جگہ کسی اور کو ڈیوٹی پر بھیجنا یا کم تنخواہ پر اپنی جگہ کسی کو مقرر کرنا:

عموماً سرکاری سکول اور کالجوں میں ٹیچر حضرات یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں، کہ اپنی جگہ پڑھانے کیلئے کسی اور کو بھیج دیتے ہیں، اور اپنی تنخواہ میں سے نصف یا کچھ حصہ اس کیلئے مقرر کر دیتے ہیں، یعنی خود ڈیوٹی نہیں کرتے اور تنخواہ وصول کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

حکومت کی طرف سے اسکول کالج وغیرہ میں پڑھانے کے لئے جو اساتذہ مقرر ہوتے ہیں، ان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی جگہ دوسرا ٹیچر کم پیسوں میں رکھ کر حکومت سے پوری تنخواہ وصول کریں، کیونکہ یہ ملازمت کا معاملہ ''اجارہ'' ہے اور اجارہ کے خلاف کام کرنا درست نہیں، جبکہ حکومت کی طرف سے بھی اس کی اجازت نہیں ہوتی، یہ حکومت کے ساتھ بھی دھوکہ ہے، اسکول ٹیچر اجیر خاص ہے، اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اس دوران کسی غیر کے لئے کام کرے، خود ڈیوٹی پر جانا ضروری ہے۔

درمختار میں علامہ حصکفی فرماتے ہیں:

"ولیس للخاص أن یعمل لغیره ولو عمل نقص من أجرته بقدر

---

(۱) الفتاوی الهندیه: ۸۳/۱

(۲) الفتاوی الشامیة: ۲۹۱/۲ ۔ ط دار الکتب العلمیه بیروت

ما عمل "۔(۱)

تبیین الحقائق علامہ زیلعی فرماتے ہیں:

(ولا یستعمل غیرہ أن شرط علیه بنفسه)أی لیس للأجیر أن یستعمل غیرہ إذا شرط علیه أن یعمل بنفسه ، لأن المعقود علیه العمل من محل معین فلا یقوم غیرہ مقامه"۔ (۲)

ترجمہ: اور کسی اور سے وہ کام نہیں کروا سکتا، اگر اس کام کو خود کرنے کی شرط لگائی ہو، یعنی اجیر (ملازم) کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی غیر سے وہ کام کرائے جب اس پر شرط رکھی ہو کہ یہ کام خود کرو گے، اس لئے کہ معقود علیہ محل معین میں کام کرنا ہے، لہذا کوئی غیر اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتا۔

بعض دفعہ چھوٹے اسکولوں میں ایسا ہوتا ہے کہ طلباء کے کم ہونے کی وجہ سے ایک مہینہ ایک ٹیچر پڑھاتا ہے اور دوسرے مہینے دوسرا ٹیچر پڑھاتا ہے، جبکہ تنخواہ دونوں کو ہر ماہ کی ملتی ہے، شرعا یہ طریقہ بھی درست نہیں ہے، ایسی صورت میں جس نے پڑھایا ہے، اس کے لئے تو تنخواہ حلال ہوگی، اور جس نے نہیں پڑھایا اس کے لئے تنخواہ جائز نہیں ہے، کیونکہ اساتذہ کو حکومت کی طرف سے جو تنخواہ ملتی ہے، وہ اسکول میں حاضر ہو کر پڑھانے پر ملتی ہے، لہذا تنخواہ حلال تب ہوگی جب وہ سکول آکر پڑھائے، ایسی صورت میں طلباء کی حق تلفی بھی ہے، کیونکہ جب ایک استاذ پڑھائے گا، تو فطری بات ہے وہ کم سبق پڑھائے گا، جس سے طلباء کا نقصان ہوگا، جو طلباء کے ساتھ بھی خیانت ہے۔

فتاویٰ حقانیہ میں ہے:

سوال: زید ایک اسکول میں ٹیچر ہے، لیکن بجائے زید کے اس کا بھائی عمرو

---

(۱) الدرالمختار:۶/۷۰

(۲) تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق:۵/۱۱۱

سکول میں ڈیوٹی دیتا ہے، تو کیا زید کا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب: صورت مسئولہ میں زید اجیر خاص ہے اور اجیر خاص شرعاً کسی دوسرے شخص سے اپنا کام نہیں کروا سکتا، ورنہ کسی حادثہ کی صورت میں تمام تر ذمہ داری اس کی ہوگی، لہٰذا زید کے لئے ایسا کرنا ناجائز ہے۔(۱)

ضابطہ نمبر (۴)

مالک کو چاہئے کہ ملازم کو جس کام کے لئے رکھا ہے وہ کام اس کو بتلا دے، اس کام کی نوعیت اور وقت بھی بتلا دے، کہ روزانہ کتنے گھنٹے ملازمت کرنی ہے؟ کام کی نوعیت بیان کرنا لازم نہیں ہے، جب روزانہ کام کی مدت مقرر ہو، البتہ بہتر ہے کہ کام کی نوعیت بھی بتلا دے۔

چنانچہ فتاویٰ شامی میں ہے:

"ویعلم النفع أیضا ببیان العمل کالصیاغة والخیاطة بما یرفع الجهالة"۔ (۲)

الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے:

"ویشترط أیضا أن تکون المنفعة المؤجر علیها معلومة القدر، وذلك أما بغایتها مثل خیاطة الثواب وعمل الباب ونحوها من إجارة الأعمال، وأما بتحدید الأجل إذا لم تکن هناك غایة معروفة،مثل خدمة الأجیر میاومة،أو مشاهرة، أو سنویا"۔ (۳)

اور اسی طرح یہ بھی شرط ہے وہ منفعت جس پر اجارہ کا معاملہ ہوا ہے اس کی

(۱) فتاویٰ حقانیہ: ۶/ ۲۵۰

(۲) شامی: ۹/ ۱۶

(۳) الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۷/ ۵۰۳۱

مقدار معلوم ہو، اور یہ یا تو غایت (انتہاء) کے ذکر سے ہوگا جیسے کپڑے کا سینا، دروازے کا بنانا وغیرہ اجارۃ علی العمل میں اور یا مدت مقرر کرنے سے ہوگا جب اس کی کوئی مشہور غایت نہ ہو، جیسے کسی کو روزانہ یا ماہانہ یا سالانہ طور پر ملازم رکھنا۔

ضابطہ نمبر (۵)

ملازم کی اجرت (تنخواہ) کی بھی تعیین کی جائے، یعنی ملازم کو یہ بتانا ضروری ہے کہ ملازم کو روزانہ یا ماہانہ کتنی تنخواہ ملے گی، صرف یہ کہہ دینا کہ آپ کو مناسب تنخواہ ملے گی، درست نہیں ہے، اگر ملازم کی تنخواہ مجہول ہو، تو یہ ملازمت درست نہیں ہے، تنخواہ کا متعین ہونا ضروری ہے۔

ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

"من استأجر أجيرا فليعلم له أجرته"۔ (۱)

ترجمہ: جس نے کسی کو مزدور رکھا تو اسے چاہئے کہ اس کی اجرت بھی اس کو بتلادی جائے۔

الفتح الربانی میں ہے:

"عن أبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ أن النبي ﷺ نهىٰ عن استئجار الأجير حتى يبين له أجرة"۔(۲)

ترجمہ: حضور ﷺ نے مزدور کو کرایہ پر لینے سے منع فرمایا یہاں تک کہ مزدور کو اس کی اجرت بتادی جائے۔

---

(۱) نیل الاوطار: ۲۹۲/۵

(۲) الفتح الربانی: ۱۲۲/۱۵۔ بحوالہ جدید معاشی نظام: (ص: ۲۸)

الفقہ الاسلامی وادلتہ میں علامہ وھبۃ الزحیلی فرماتے ہیں:

"قال النبی ﷺ: من استاجر أجیراً فلیعلمه أجره والعلم بالأجرة لایصح إلا بالإشارة والتعیین"۔ (۱)

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے کسی کو مزدور رکھا، تو اس کو اس کی اجرت بتادے، اور اجرت کا علم نہیں ہوسکتا، مگر اشارہ سے یا متعین کرنے سے۔

"وعن أبی ھریرۃؓ وأبی سعیدؓ قالا: من استاجر أجیراً فلیعلمه أجره" (۲)

جس نے کسی کو مزدور رکھا تو اسے چاہئے کہ اسے مزدوری بتادے۔

اسی طرح عثمانؓ سے بھی مروی ہے، فرماتے ہیں:

"من استاجر أجیراً فلیبین له أجره"۔ (۳)

تنخواہ:

(الف) کسی بھی ادارے کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے ملازمین کو ان کا حق الخدمت بروقت دینے کا انتظام کرے، اس کا ثبوت ایک حدیث سے ملتا ہے، آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

"أعطوا الأجیر أجره قبل أن یجف عرقه"۔ (٤)

ترجمہ: مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اسکی مزدوری دے دو۔

لہٰذا ملازم کی تنخواہ میں بلاوجہ ٹال مٹول کرنا، یا اسے ٹلانے کی کوشش کرنا شرعاً ناجائز

(۱) الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۳۸۲۲/۵

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۲۹/۷

(۳) حوالہ بالا

(٤) سنن ابن ماجہ، باب اجر الاجراء، (ص ۱۷٦) قدیمی کراچی

ہے۔

(ب) اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے، کہ ملازم کو تنخواہ اس کے معیار، تعلیم، کام اور اس کی بنیادی ضروریات سامنے رکھ کر متعین کی جائے، ملازم کو اتنی کم تنخواہ دینا کہ جس کی وجہ سے وہ اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہ رہے، بہت سے مسائل پیدا ہونے کا باعث بنتا ہے، ایک سروے کے دوران بہت سے لوگوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہمارے معاشرے میں پائے جانے والے رشوت کے ناسور کا ایک بڑا سبب ''کم تنخواہ'' ہے۔

ایک صاحب نے اس کا پس منظر ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ:

''ہندوستان میں جب انگریزوں کی حکومت تھی، تو وہ ملازمین کو کم تنخواہ دیتے تھے، البتہ یہ کہہ دیتے تھے کہ اپنا حساب عوام سے پورا کر لینا (یعنی لوگوں سے رشوت لے کر پورا کر لینا) اس طرح برصغیر میں رشوت لینے کا رواج شروع ہوا''۔

انہوں نے مزید بتایا کہ:

''دراصل انگریز کے پیش نظر یہ ہوتا تھا کہ ہندوستان کا سرمایہ زیادہ سے زیادہ برطانیہ منتقل کیا جائے اور اس کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ ملازمین کو تنخواہیں کم دی جائیں''۔

اس بات میں کتنی صداقت ہے، اس کے بارے میں تو بندے کو تحقیق نہیں، البتہ یہ بات مشاہدہ سے ثابت ہے کہ ہمارے ہاں تنخواہوں کا معیار دیگر ممالک کے مقابلے میں کافی کم ہے، جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، کیونکہ دوسری طرف مہنگائی کئی گنا تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

دراصل ملازمت شرعی نقطہ نظر سے ''عقد اجارہ'' ہے، جس میں جانبین کی باہمی رضا

مندی سے جو بھی اجرت طے کر لی جائے وہ جائز ہے، بشرطیکہ اس میں ایک فریق نے دوسرے فریق کی منظوری زبردستی حاصل نہ کی ہو، اس طرح جو اجرت بھی طے ہو جائے، شرعاً وہ درست ہے، خواہ وہ تنخواہ اہلیت کی بنیاد پر مقرر ہوئی ہو، یا کام کی بنیاد پر یا ملازم یا مزدور کی ضرورت کی بنیاد پر سب جائز ہے، باہمی رضاء مندی ہونا ضروری ہے۔

البتہ اسلامی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اگر وہ دیکھے کہ محنت کرنے والوں کی اجرتیں مناسب نہیں ہیں، یا بہت کم ہیں، تو وہ اجرتوں کا کوئی معیار بھی مقرر کر سکتی ہے، در مختار میں ہے:

"ولا يسعر حاكم لقوله عليه السلام: لاتسعروا فإن الله هو المسعر القابض الرازق، إلا إذا تعدى الأرباب عن القيمة تعديا فاحشا فيسعر بمشورة أهل الرأي"۔(۱)

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

"شرعاً اجرت کے تعین کا معیار باہمی معاہدہ ہے، یعنی باہمی رضامندی سے جو اجرت مقرر کر دی جائے، وہ شرعاً جائز ہے، البتہ ہر فریق پر دیانتاً یہ واجب ہے کہ دوسرے فریق کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر کوئی، ایسی اجرت مقرر نہ کرے جو اتنی کارکردگی کے لحاظ سے عرفاً ناکافی یا بہت زائد ہو، چنانچہ یہ آجر کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اجرت کے تعین کے وقت اس بات کا پورا لحاظ رکھے کہ اجیر کو اس کی کارکردگی کے مطابق مناسب اور کافی اجرت ملے، دوسرے الفاظ میں قانونی طور پر اجرت کے تعین کا معیار اگرچہ باہمی معاہدہ ہے، لیکن اخلاقی طور پر اور دیانتاً اس کا معیار کارکردگی کی نوعیت ہے اور اگر کسی جگہ آجر اپنی اس اخلاقی ذمہ داری کو پورا کرنے کی بجائے مزدوروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر

(۱) الدر المختار: ۳۹۹/۶ ۔ ط سعید کمپنی

کم اجرت مقرر کرتے ہوں، تو ایسی صورت میں حکومت کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ کم سے کم اجرت متعین کردے، اس صورت میں آجروں پر اس کی پابندی قانوناً بھی لازمی ہوگی"۔(۱)

دو قسم کے مزدور:

اگرچہ ہر کام میں دماغ اور جسم دونوں ایک ساتھ استعمال ہوتے ہیں، لیکن اعتبار غالب کا ہے، اگر ذہنی محنت غالب ہے، تو ذہنی محنت کی وجہ سے اجرت لیتا ہے، اگر جسمانی قوت غالب ہے، تو جسمانی محنت کی وجہ سے اجرت لیتا ہے۔

ذہنی محنت کرنے والے کے لئے صرف دماغی صلاحیت کافی نہیں ہے، جب تک بدن کے لحاظ سے تندرست نہ ہو، اس طرح بدنی محنت کرنے والے کے لئے جسمانی قوت کافی نہیں، جب تک ذہنی توازن درست نہ ہو، پاگل کتنا قوی اور توانا ہو، پھر بھی کوئی اس کو اجرت پر مزدور نہیں رکھتا۔

ڈاکٹر، وکیل، پروفیسر، معلم، انجینئر اور سائنس دان ذہنی محنت کی وجہ سے اجرت لیتے ہیں، اگرچہ ان کا جسم بھی ان کے کام میں استعمال ہوتا ہے، لیکن جسمانی محنت ان کی ذہنی محنت کے تابع ہوتی ہے، اور نہ ہی ان کی جسمانی محنت زمیندار، اور گھارا ڈھونے والے کی طرح سخت ہوتی ہے اور نہ یہ افراد زمیندار اور مزدور والی محنت کے عادی ہوتے ہیں، یہ افراد ایک دن کے لئے بھی دن بھر مزدوری کرنے والے مزدور کی طرح جسمانی مشقت برداشت نہیں کر سکتے، ان کے مقابلے میں مزدور، کاشت کار، قلی، ماہی گیر وغیرہ جسمانی مشقت کی وجہ سے اجرت لیتے ہیں، اگرچہ ان کا دماغ بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن وہ جسمانی مشقت کے تابع ہوتا ہے۔

---

(۱) فتاویٰ عثمانی: ۳/۳۸۶

اگر ایک وکیل یا ڈاکٹر مزدوری یا کاشتکاری شروع کردے، تو ان کو ایک مزدور کی تنخواہ ملے گی، اس لئے کہ اس کام میں وکیل اور ڈاکٹر کا دماغ اور ان کی صلاحیت استعمال نہیں ہو رہی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ عام مزدور اپنی جسمانی قوت کی زیادتی کی وجہ سے اس ڈاکٹر اور وکیل (جو مزدوری کررہے ہیں) اس سے زیادہ کمائے۔

بعض اوقات پتہ نہیں چلتا کہ ذہنی قوت کسی کام میں زیادہ استعمال ہورہی ہے یا جسمانی؟ مثلاً ایک الیکٹریشن، دماغ اور جسم دونوں کو خوب استعمال میں لا رہا ہے، پورے طور پر پتہ نہیں چلتا کہ کونسی قوت غالب ہے؟

بہرحال! اجرت ذہنی صلاحیت کی وجہ سے ملتی ہے، یا جسمانی قوت کی وجہ سے، یا دونوں کی وجہ سے، لیکن اجرت کی بنیاد ذہنی اور جسمانی قوت ہے۔

اجرت کا معیار:

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ اجرت ذہنی یا جسمانی قوت کے استعمال کی وجہ سے دی جاتی ہے، معیار کس طرح قائم کریں؟ کس کو زیادہ اور کس کو کم تنخواہ اور اجرت دی جائے۔؟

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذہنی قوت استعمال کرنے والوں کو برابر مساوی تنخواہ دی جائے، اسی طرح سب جسمانی مشقت کرنے والوں کے لئے برابر اجرت مقرر ہو، لیکن ایسا کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ دماغی قوت استعمال کرنے والوں کی صلاحیت میں بھی فرق ہوتا ہے اور میدان عمل بھی جدا ہوتے ہیں۔

ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں میں محنت، تجربہ، عمر، ماحول، استاذ، موسم اور ملک وغیرہ امور کی وجہ سے بڑا فرق ہوتا ہے، یورپ میں بڑی یونیورسٹیاں، قابل اساتذہ، اور اعلیٰ تعلیمی معیار کی وجہ سے جو ڈاکٹر اور وکیل یا انجینئر بنتا ہے، وہ یقیناً دوسرے ملک کے ڈاکٹر اور انجینئر سے بہتر ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دیگر ممالک کے ڈاکٹر وکلاء انجینئر وغیرہ اسپیشلائزیشن (تخصص) کے لئے یورپ کا رخ کرتے ہیں، ڈاکٹر تو ہر ملک میں بنتے ہیں، لیکن یورپ کا

ڈاکٹر باصلاحیت اور معیاری ہوتا ہے، جس کی وجہ سے لوگ ان سے علاج یا تعلیم حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، لفظ ڈاکٹر کا اطلاق ہر ملک کے ڈاکٹر پر ہوتا ہے، لیکن بڑا عہدہ یا زیادہ تنخواہ اس ڈاکٹر کو ملے گی، جو یورپ میں ڈاکٹر بنا ہو، اس لئے کہ ان کا تعلیمی معیار بلند ہوتا ہے، یا کوئی خود اپنے فن مثلاً ڈاکٹری میں تعلیمی محنت، عمر یا تجربہ کی وجہ سے بڑھ جائے، تو یہ ڈاکٹر بھی عہدہ اور تنخواہ کے لحاظ سے آگے ہوگا۔

اس طرح جسمانی مشقت کرنے والوں کی صلاحیتوں میں بھی عمر اور تجربہ وغیرہ کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے، ان کی تنخواہوں میں بھی مساوات ممکن نہیں، ایک مزدور اچھا کام کرتا ہے، ایک کا کام ناقص ہوتا ہے، بعض تجربہ کار ہوتے ہیں، جبکہ بعض اناڑی ہوتے ہیں، بعض کا خاندانی پیشہ ہوتا ہے، بعض اس میدان کے نووارد ہوتے ہیں، لوگ خاندانی پیشہ ور کو ترجیح دیتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ نہ تو دماغی محنت کرنے والوں کے مابین اجرت میں مساوات قائم کرنا صحیح ہے اور نہ جسمانی مشقت کرنے والوں میں، ورنہ اچھا استاد، تعلیمی ماحول، عمر، تجربہ وغیرہ اہم موثر امور بے معنی ہوکر رہ جائیں گے، بلکہ مساوات ممکن ہی نہیں، نہ عقلاً، نہ شرعاً۔

تنخواہوں میں تفاوت:

ذہنی محنت کرنے والوں کی تنخواہوں میں بھی تفاوت ضروری ہے اور جسمانی محنت کرنے والوں کی اجرت میں بھی تفاوت ضروری ہے۔

ایک تفاوت یہ بھی ہے کہ ذہنی محنت کرنے والوں کو جسمانی محنت کرنے والوں سے زیادہ تنخواہ دی جائے، کیونکہ دماغ اصل ہے اور جسم اس کے تابع ہے۔ دماغی محنت کرنے والا جسمانی لحاظ سے کمزور اور نحیف بھی ہوسکتا ہے، لیکن کمزور اور نحیف جسمانی مشقت نہیں کر سکتا، تمام علوم وفنون کا موجد دماغ ہے، حکومت کو چلانے کے لئے اعلیٰ ذہنی صلاحیت ہی درکار ہوتی ہے، اس میں جسم کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے، سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ عبد

العزیز بن بازؒ نابینا تھے، جو ایک جسمانی کمزوری تھی، لیکن اعلیٰ ذہنی صلاحیت کی وجہ سے مفتی اعظم کے مسند پر فائز تھے، بڑے بڑے انقلابات لانے والے لوگ اچھی ذہنی صلاحیت کے مالک ہوئے ہیں، اس لئے ذہنی محنت کرنے والوں کی تنخواہ زیادہ ہونی چاہئے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ غریب مزدور کا خوب استیصال ہو، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جسمانی محنت کرنے والوں کے مقابلے میں ذہنی محنت کرنے والوں کو زیادہ اجرت دی جائے، لہٰذا اجرت صلاحیت، محنت، مشقت اور حسن کارگردگی کی وجہ سے مقرر کرنی چاہئے، ضرورت کے لحاظ سے اجرت مقرر کرنا صحیح نہیں ہے، اس طرح مہارت، صلاحیت، تجربہ اور حسن کارگردگی وغیرہ اہم امور بے معنی ہو کر رہ جائیں گے، پھر فطری طور پر ہر شخص کی خواہش اور آرزوئیں جدا جدا اور بیشمار ہیں، کسی کو عمدہ کپڑے اچھے کھانے اور بڑھیا مکان کی خواہش ہوتی ہے، کوئی عزت اور شہرت کو پسند کرتا ہے، کوئی اقتدار کا بھوکا ہوتا ہے، کوئی سیر و شکار کا شوقین ہے، کوئی کام کارسیا ہے، کوئی کام چور ہے، ان امور کی وجہ سے کسی کی ضرورتیں زیادہ ہیں، کسی کی کم، کسی کے بچے زیادہ ہوں گے، کسی کے کم ہوں گے، اس لئے اس طرح اجرت مقرر کرنا مشکل ہو جائے گا۔(۱)

معلوم ہوا کہ تنخواہ مقرر کرنے کا اصل معیار صلاحیت اور تجربہ ہے، اور ان میں فرق ہوتا ہے، اس لئے تنخواہوں میں بھی فرق ہونا ایک طبعی امر ہے۔

ضابطہ نمبر (۶)

مالک کے لئے ضروری ہے کہ کسی کو ملازم رکھتے وقت مدت ملازمت بھی بیان کرے، اور یہ مدت بیان کرنا شرط ہے، جیسے سرکاری ملازمین کی مدت ملازمت پہلے سے متعین ہوتی ہے، غالباً ساٹھ سال عمر تک ملازم رکھتے ہیں، اس کے بعد ملازم کو فارغ کر دیتے ہیں:

شیخ وہبہ زحیلی فرماتے ہیں:

(۱) اسلامی معیشت، مولانا ذاکر حسن نعمانی: (ص: ۲۱۴)

"وإنما يشترط بيان المدة فقط"۔ (۱)

آج کل عموماً لوگ اس کا خیال نہیں رکھتے، ملازم رکھتے ہوئے مدت ملازمت کو بیان نہیں کیا جاتا اور مالک جب ملازم کو فارغ کرتا ہے، تو اس وقت لڑائی جھگڑے کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔

کام کا دورانیہ

کسی بھی ملازم سے اصولی طور پر اتنا کام لینا چاہیے، جسے وہ نشاط طبع کے ساتھ کر سکے اور اس کے ساتھ ساتھ گھریلو ذمہ داریوں اور مصروفیات کے لئے مناسب وقت نکالنے کے قابل بھی ہو، اس کے لئے بین الاقوامی سطح پر بات تسلیم کی گئی ہے کہ غیر تدریسی عملے کے کام کا دورانیہ آٹھ یا نو گھنٹے ہونا چاہیے، یعنی صبح نو تا شام پانچ بجے تک، چنانچہ عام طور پر ہمارے دفتری اوقات صبح نو بجے سے شام ۵ بجے تک ہوتے ہیں اور جب کوئی ادارہ کسی ملازم کے ساتھ ملازمت کا ایگریمنٹ کر رہا ہوتا ہے، تو اس میں بھی وضاحت ہوتی ہے کہ اوقات کار شام پانچ بجے یا چھ بجے تک ہوں گے، لیکن بعض مرتبہ اس کا لحاظ نہیں رکھا جاتا اور ملازمین کو آٹھ، نو بجے تک بیٹھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

شرعاً ملازم سے اضافی اوقات میں ملازم کی دلی رضامندی کے بغیر اور اضافی اجرت دیئے بغیر کام لینا جائز نہیں ہے۔

ہاں! اگر کوئی ملازم اپنی خوش دلی سے اضافی وقت لگا کر ادارے کا کام کرنا چاہے اور ادارہ اسے اپنے مفاد کے لئے بہتر سمجھے، تو اس کی اجازت دے سکتا ہے، مختلف ملازمین نے گفتگو کے دوران اضافی اوقات میں ملازم کی دلی رضامندی کے بغیر کام لینے والے طرز عمل کی درج ذیل خرابیاں ذکر کی ہیں:

---

(۱) الفقه الاسلامي وادلته: ۸۱۳/۵

۱)...... یہ ہرگز ضروری نہیں کہ جو ملازم دیر تک بیٹھے، وہ زیادہ محنتی بھی ہو، بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ملازم کو معلوم ہوتا ہے کہ رات آٹھ بجے سے پہلے مجھے دفتر سے نکلنے کی اجازت نہیں ملے گی، تو اپنے کام کی رفتار سست کر دیتا ہے، وہی کام جو وہ پانچ بجے تک مکمل کر سکتا تھا، رات آٹھ بجے مکمل کرتا ہے، اس طرح اضافی وقت لگانے کے باوجود ادارے کا اتنا اضافی کام نہیں ہوتا، جتنا ملازم کا اضافی وقت خرچ ہوتا ہے۔

۲)...... رات دیر تک آفس میں رہنے کی وجہ سے آدمی کے لئے اپنے گھر والوں کو مناسب وقت دینے اور اپنے آرام کرنے کا موقع بہت کم ملتا ہے، جس سے اس کے لئے کام کے وقت میں کام کرنے کی صلاحیت متاثر ہوسکتی ہے، اس لئے کمپنی یا ادارے کو چاہئے کہ ملازمین پر زیادہ وقت دینے کے لئے دباؤ نہ ڈالیں، اور انہیں بروقت دفتر میں حاضر ہونے اور بروقت چلے جانے کا پابند بنائیں۔

مختلف کمپنیوں کے سربراہاں سے گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ بہت سے ایسے ادارے جنہوں نے آنے جانے کے اوقات میں پابندی کا اصول اپنایا، انہیں بہتر نتائج ملے، چنانچہ ایک کمپنی کے بارے میں ہمیں ان کے ایک سابق افسر نے بتایا کہ وہاں کمپنی نے یہ قانون بنایا کہ جو ملازم آفس اوقات کے بعد بھی دفتر میں بیٹھے گا، اس کی تنخواہ سے تاخیر کے حساب سے رقم کاٹی جائے گی، جس کا خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ دفتر کے تمام ملازمین وقت کے اندر اپنی ذمہ داریاں محنت سے نمٹانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

اضافی کام کی اضافی اجرت

جیسا کہ پیچھے گزرا کہ کمپنی کو اپنے ملازم سے طے شدہ تنخواہ میں اتنا کام یا اتنے اوقات تک کا کام کرانے کی اجازت ہے، جو معاہدے میں طے ہو، مزید اوقات کے لئے اسے بلا معاوضہ کام کرنے پر مجبور کرنا جائز نہیں۔

ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اضافی اوقات کی الگ سے اضافی اجرت مقرر کی جائے، اور پھر

ملازم کو اختیار دیا جائے کہ اگر وہ چاہے تو اضافی اوقات لگا کر اضافی اجرت حاصل کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے، یعنی اسے اضافی وقت دینے پر اجرت دینے کے باوجود بھی مجبور کرنا درست نہیں ہے۔

غلط بیانی کر کے تنخواہ میں اضافہ کرانے کا حکم

بعض غلط بیانی سے کام لے کر اپنی تنخواہ بڑھا دیتے ہیں، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے، یا نہیں؟ تو اس کا جواب بالکل واضح ہے، غلط بیانی کر کے تنخواہ بڑھانا ناجائز عمل ہے، اگر چہ وہ تنخواہ اس کے لئے حلال ہوگی، لیکن چونکہ غلط بیانی کی ہے، تو غلط بیانی کا گناہ اس کو ملے گا۔

اوور ٹائم لگائے بغیر اس کی تنخواہ وصول کرنے کا حکم

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

سوال: میں بحیثیت اسنو ٹو ٹائپسٹ کے ملازمت کرتا ہوں، میرے محکمے کا سب سے بڑا سربراہ چیف انجینئر ہوتا ہے، میرے محکمے میں ہر ملازم کو تقریباً تیس گھنٹے کا اوور ٹائم ملتا ہے، روز کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کے حساب سے، آفس کے اوقات کے بعد عموماً کبھی کبھی گھنٹہ دو گھنٹہ اوور ٹائم کرنا پڑتا ہے، اکثر ہم لوگ دو بجے کے بعد اپنے گھر چلے جاتے ہیں، کیونکہ کام ہی اتنا ہوتا ہے، اب دریافت یہ ہے کہ بغیر اوور ٹائم کئے ہوئے اوور ٹائم کی رقم لی جاسکتی ہے یا نہیں؟ چیف انجینئر صاحب کو بھی اس کا پتہ ہے کہ کبھی کبھی اوور ٹائم کے لئے رکتا ہے، اکثر نہیں رکتا، اس کے باوجود وہ تیس گھنٹے کا اوور ٹائم لگا دیتے ہیں، جبکہ آفس کے کام کے بعد اوور ٹائم کا کام نہیں ہوتا۔

جواب: اوور ٹائم کے نام سے کوئی رقم وصول کرنا اسی وقت جائز ہوگا جبکہ واقعتاً

ملازم نے وقت مقررہ سے زائد کام کیا ہو، جس روز وقت مقررہ سے زائد کام نہیں کیا، اس روز کا اوورٹائم لینا درست نہیں ہے۔ اگر چیف انجینئر صاحب واقعۃً ملازمین کی خیر خواہی کرنا چاہتے ہیں، تو تنخواہ میں اضافہ کرا دیں، لیکن اوورٹائم کے نام سے غلط بیانی کی شرعاً اجازت نہیں ہوسکتی۔(۱)

غلط اوورٹائم کی تنخواہ لینا:

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

سوال: آج کل خاص طور پر سرکاری دفاتر میں یہ بیماری عام ہے کہ لوگ بوگس اورٹائم اور بوگس ٹی اے ڈی حاصل کرتے ہیں، جس سے گورنمنٹ کو کروڑوں روپے سالانہ نقصان ہوتا ہے، اس طرح بعض لوگ مہینہ میں ۹ یا ۱۰ دن دفتر آتے ہیں، مگر تنخواہ پورا مہینہ حاصل کرتے ہیں:

(الف) وہ لوگ جو اوورٹائم ٹی اے ڈی اور بوگس تنخواہ حاصل کرتے ہیں، ان کی کمائی کیسی ہے؟

(ب) جو افسران اوورٹائم، ٹی اے، ڈی اے اور تنخواہ تیار کرتے ہیں اور ان کاغذات پر کئی افسران دستخط بھی کرتے ہیں، کیا انہیں بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے، یا وہ بھی اس کام میں برابر کے شریک ہیں، ان لوگوں کی کمائی سے زکوۃ، صدقات اور دوسرے فلاحی کاموں میں خرچ کی گئی رقم قابل قبول ہے یا نہیں؟

جواب: ظاہر ہے کہ ان کی کمائی خالص حرام ہے، اور جو افسران اس کی منظوری

---

(۱) فتاوی محمانی: ۳/۳۹۱

دیتے ہیں، وہ اس جرم اور حرام کام میں برابر کے مجرم ہیں، صدقہ وخیرات حلال کمائی سے قبول ہوتی ہے، حرام سے نہیں، حرام مال سے صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص گندگی کا پیکٹ کسی کو تحفہ میں دے۔(۱)

جھوٹ بول کر اضافی تنخواہ کسی غریب کیلئے بھی لینا جائز نہیں ہے

جیسا کہ احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: ایک سرکاری ادارہ ہے، جہاں کے ملازمین کوئی اوور ٹائم وغیرہ نہیں لگاتے، مگر حکومت کی طرف سے جو افسران ان پر نگران ہیں، وہ اوور ٹائم کی اجرت دلوا دیتے ہیں، تو شرعاً یہ جائز ہے، جبکہ ملازمین غریب طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور تنخواہ سے ان کے اخراجات پورے نہیں ہوتے؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب: اگر اوور ٹائم میں مزید کام لے کر اس کے عوض اصل اجرت سے زائد رقم دی جاتی ہے، تو یہ جائز ہے اور اگر زائد کام لئے بغیر ہی اوور ٹائم کا حیلہ بنا کر رقم دی جاتی ہے، تو یہ حلال نہیں۔(۲)

تنخواہ کے علاوہ اضافی کمیشن دینے کی صورتیں اور حکم:

اکثر و بیشتر کمپنی اپنا مال بیچنے کے لئے کچھ ایسے ملازمین بھی رکھتی ہے، جو مختلف دکانوں پر جا کر مال بیچتے ہیں، ان کی تنخواہوں کا حساب عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ ان کی تنخواہ کے بنیادی طور پر تین حصے ہوتے ہیں:

(۱) Fixed salary یعنی کچھ متعین رقم جو ملازم کو ہر ماہ بس اس کی

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۸/۲۹۶

(۲) احسن الفتاویٰ: ۷/۳۰۳ ۔ط ایچ ایم سعید کمپنی

حاضری پر دیدی جاتی ہے، اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ اس نے sale کم کی ہے، یا زیادہ۔

(۲) Carton incentive / Commission یعنی جو رقم ملازم کو اس کی طرف سے کی گئی sale فروخت شدہ مال کی Valve (قیمت) یا Quantity (تعداد) کے حساب سے دی جاتی ہے، مثلاً جتنے کا مال ایک ماہ میں بیچا ہے، اس کا 0.5٪ یا جتنے ڈبے بیچے، ہر ڈبے پر پانچ روپے ملیں گے۔ اب ملازم زیادہ یا کم جتنی بھی sale کرتا ہے، اسے اس حساب سے کمیشن دیا جاتا ہے۔

(۳) تیسرا حصہ Target hievement allowance Ac کہلاتا ہے، یہ بھی ملازم کی سیل پر ملتا ہے، لیکن اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ کمپنی ملازم کو ہر ماہ کے لئے ایک ٹارگٹ دیتی ہے کہ آپ نے مثلاً ایک لاکھ روپے کی sale کی ہے اور ساتھ ساتھ یہ مقرر کرتی ہے کہ اگر ملازم نے دیا گیا ٹارگٹ 100 ٪ پورا کیا، تو اسے 5000 روپے ملیں گے اور اگر اس نے 80٪ پورا کیا تو 4000 ملیں گے، اور اگر اس نے ٪ 110 تک حاصل کیا تو اسے 6000 ملیں گے، لیکن اگر اس سے کم ٹارگٹ ٪80 بھی مکمل نہ کیا تو وہ Target Achievement allowance کا حقدار نہیں ہوگا، ایسی صورت میں ملازم کو Fixed salary اور Commission دیا جاتا ہے، اس میں کمی نہیں ہوتی، تاہم تیسرے نمبر والا الاونس نہیں ملتا۔

سوال: یہ ہے کہ sale staff کی کمیشن اور تنخواہ کا مندرجہ بالا طریقہ کار درست ہے یا نہیں؟

جواب یہ ہے کہ اس صورت میں ملازم کی تنخواہ اور کمیشن کا طریقہ کار شرعا درست ہے، اس میں پہلے نمبر کی متعین رقم (Fixed salary) ملازم کو اس کے وقت کے بدلے اور دوسرے نمبر پر ذکر کردہ Commission کی رقم اس کے عمل کے بدلے دی جاتی ہے، یہ دونوں رقوم ملازم کی تنخواہ کا حصہ ہیں اور ایک ملازم کے لئے وقت اور عمل دونوں کے حساب سے اجرت مقرر کرنا جائز ہے۔

البتہ تیسرے نمبر کی رقم جوکہ Target hievement allowance Ac کہلاتی ہے اور ملازم کو ایک متعین حد تک کام کرنے پر ہی ملتی ہے، اس سے کم پر نہیں ملتی، یہ در اصل کمپنی کی جانب سے ملازم کی حوصلہ افزائی اور کارکردگی بڑھانے کے لئے ایک اضافی انعام کی حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا جب ملازم کمپنی کو دیے گئے ہدف کو حاصل کرلے گا، تو وہ کمپنی کے اعلان کردہ طریقہ کار کے مطابق اس انعام کا حق دار ہوگا، ورنہ نہیں۔(۱)

ضابطہ نمبر(۷)

مالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ملازم کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، مالک ملازم سے اس کی طاقت سے زیادہ کام نہ لے، ملازم سے طاقت سے زیادہ کام لینا یہ درست نہیں ہے، اسی طرح بعض مالک اپنے ملازمین کو بسااوقات انتہائی برا بھلاحتیٰ کہ گالیاں تک بھی دے جاتے ہیں، ایسا کرنا جائز نہیں ہے، البتہ ان کو متنبہ کرسکتا ہے، مگران کو مارنا یا زدوکوب کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، اگر مالک ایسا کرے گا، تو حکومت اس کو سزاء بھی دے سکتی ہے، اور جرمانہ بھی کرسکتی ہے، بخاری شریف کی روایت ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) تجارتی کمپنیوں کا لائحہ عمل: (ص:۱۰۱)

"سباب المسلم فسوق وقتاله كفر"۔(۱)

مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس کو مارنا کفر ہے۔

اور حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

''اپنے ماتحت کے ساتھ بدخلقی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوسکتا''۔

الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں ہے:

"وقد اتفقوا على عدم جواز ضرب الإنسان المستاجر للخدمة، فإذا ضربه وعتبه، كان عليه الضمان ،لأن الإنسان الكبير يؤمر و ينهى ويفهم ولا معنى لضربه"۔(۲)

اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ خدمت کے لئے اجرت پر لئے ہوئے انسان کو مارنا جائز نہیں ہے، جب مالک اس کو مارے گا یا سزا دے گا، تو اس پر ضمان لازم ہوگا، کیونکہ بڑے آدمی کو حکم دیا جاتا ہے، اس کو منع کیا جاتا ہے اور اس کو سمجھایا جاتا ہے مارنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

ملازم کے ساتھ عزت اور تکریم کا معاملہ کرنا:

کمپنی اور ادارے والوں کو چاہئے کہ ملازم کے ساتھ عزت وتکریم کا معاملہ کریں، کیونکہ بحیثیت انسان وہ ایک قابل احترام ذات ہے، جیسا کہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ آدَمَ﴾(۳)

ہم نے ابن آدم کو تکریم بخشی۔

لہٰذا کمپنی، دکان، کسی بھی محکمے کا ملازم خواہ کسی بھی درجے کا ہو، اس کے ساتھ باعزت

(۱)صحیح البخاری:۱/۱۲۔باب خوف المؤمن

(۲)الفقہ علی المذاہب الاربعہ:۳/۱۲۴)

(۳)سورہ بنی اسرائیل، آیت:۷۰

انسان کا برتاؤ کرنا چاہئے۔

ضابطہ نمبر (۸)

مہینہ پورا ہوتے ہی ملازم تنخواہ کا مستحق ہوجاتا ہے، مسند احمد بن حنبل میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے:

"ولكن العامل إنما يوفى أجره إذا قضى عمله "۔(۱)

مالک کو چاہئے کہ ملازم کو تنخواہ بروقت ادا کرے، تنخواہ ادا کرنے میں ٹال مٹول سے کام نہ لے، تنخواہ ادا کرنے کرنے کے لئے جو وقت مقرر ہوا ہو، اس وقت پر تنخواہ دینا ملازم کو ضروری ہے۔

اگر اتفاقاً کسی دن یا مہینہ تاخیر ہوجائے، تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر مالک عادۃً ایسا کرتا ہو، تو مالک قانونی اور اخلاقی حیثیت سے مجرم ہوگا۔ حدیث میں ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"أعطوا الأجير أجره قبل أن يجف عرقه "۔(۲)

مالک (محکمہ) اور ملازم میں تنخواہ ادا کرنے کے لئے جو مہینہ مقرر ہوا ہے، اسی مہینے کا اعتبار ہوگا، ہمارے ہاں لوگ عموماً شمسی مہینوں کے مطابق معاملات طے کرتے ہیں اور اسی کا اعتبار کرتے ہیں، یعنی ہر انگریزی مہینے کی یکم یا دو کو ملازم کو تنخواہ دی جاتی ہے، چاہے مہینہ ۲۸ دن کا ہو، یا ۳۱ دن کا۔

لیکن مزدور یا ملازم مہینے کے درمیان میں کام کے لئے آیا ہے، مثلاً ۲۰ جنوری کو ملازم نے کام شروع کیا، تو اس صورت میں وہ پورے جنوری کے مہینے کی تنخواہ کا مستحق نہ ہوگا، بلکہ جنوری کے صرف دس دنوں کی اس کو تنخواہ ملے گی اور باقی ہر مہینے کے اختتام پر اس کو تنخواہ

---

(۱) الفقه الاسلامی وادلته: ۷/ ۵۰۳۰

(۲) ابن ماجه بحواله الفقه الاسلامی وادلته: ۲/ ۵۳۸

ملے گی۔

فقہاء کرام ماہانہ تنخواہ کے بارے میں اسلامی مہینوں کا اعتبار کرتے ہیں، اسلامی مہینے چونکہ ۲۹ یا ۳۰ دن کے ہوتے ہیں، ۲۹ سے کم اور ۳۰ سے زیادہ اسلامی مہینہ نہیں ہوسکتا، اس لئے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی ملازم مہینے کے شروع میں ملازمت شروع کرے، مثلا یکم محرم کو ملازمت شروع کی، تو پھر چاند کے مہینوں کے اعتبار سے اس کو تنخواہ ملے گی، چاہے مہینہ ۲۹ دن کا ہو، یا ۳۰ دن کا، لیکن اگر درمیان مہینہ کام شرع کیا، تو پھر بالاجماع ۳۰ دن گزرنے کے بعد ملازم تنخواہ کا مستحق ہوگا۔

چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے:

”فإن وقع العقد في غرة الشهر يقع على الأهله بلا خلاف، حتىٰ إذا نقص الشهر يوما كان عليه كمال الأجرة، وإن وقع بعد ما مضى بعض الشهر، ففي إجارة الشهر يقع علىٰ ثلاثين يوما بالإجماع“۔(۱)

ترجمہ: اگر عقد ہوا ہو مہینے کے شروع میں، تو چاند کے مہینے کا اعتبار ہوگا بلا کسی اختلاف کے، یہاں تک کہ اگر مہینہ ایک دن کم ہوا تو اس کے ذمے پوری اجرت لازم ہوگی (مہینے کی) اور اگر عقد بعض ایام گزرنے کے بعد واقع ہوا تو اگر اجارہ مہینے کا تھا تو بالاجماع تیس دن پر یہ عقد واقع ہوا ہے (یعنی تیس دن بعد اس کو تنخواہ ملے گی)

ہمارے ہاں انگریزی مہینوں کا اعتبار ہوتا ہے، یعنی ہر انگریزی مہینے کی یکم یا ۲، ۳ کو تنخواہ ملازمین کو دے دی جاتی ہے، اس پر چونکہ طرفین کا شروع سے معاہدہ ہوجاتا ہے، اس لئے یہ بھی جائز ہے، جب دونوں اس پر راضی ہوں۔

---

(۱) عالمگیری: ۴/ ۴۶۷

ملازم وقت پورا پورا دے:

ملازم کو چاہئے کہ اپنا کام دیانتداری اور امانت سے کرے اور ملازمت کے اوقات پورے پورے دے، لیکن اگر وقت میں کمی کرتا ہے، ملازم وقت پورا نہیں دیتا، تو جو وقت اس نے ملازمت میں نہیں لگایا اور اس کی تنخواہ لے رہا ہے، تو یہ تنخواہ اس کے لئے حلال نہیں ہے، بلکہ ملازم کے لئے مستحب یہ ہے کہ اوقات ملازمت سے زیادہ وقت دے، اور جو کام اس کے ذمے ہے، اس سے زیادہ کام کرے، تاکہ مالک اس سے خوش ہو اور ایسا کرنا ملازم پر مستحب ہے اور باعث اجر وثواب ہے اور جب ملازم وقت پورا اور کام ٹھیک کر رہا ہے، تو مالک کے لئے مستحب ہے کہ وہ مزدور یا ملازم کو تنخواہ دیتے وقت اگر اپنی طرف سے کچھ زیادہ تنخواہ دے، تو یہ بھی افضل اور باعث اجر وثواب ہے۔

چنانچہ امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں:

"إنه يستحب للأجير أن يزيد شياءً من العمل المعين استرضاء و استطابة لقلب المستاجر، كما إن المستحب للمستاجر أن يزيد شياء على الأجرة"۔(۱)

ترجمہ: ملازم کے لئے مستحب ہے کہ وہ عمل معین سے زیادہ کام کرے مستاجر کے دل کی خوشی اور رضامندی کی خاطر، جیسے مستاجر کے لئے مستحب ہے کہ وہ اجرت میں کچھ زیادہ مزدور کو دے۔

اجیر خاص پر ضمان نہیں ہے

دوران ملازمت ملازم سے اگر کوئی چیز ضائع ہوگئی، یا ٹوٹ گئی، یا گم ہوگئی، یا جل گئی، تو

(۱) احکام القرآن: ۹۶/۳

ملازم پر اس کا ضمان نہیں آئے گا، البتہ اگر جان بوجھ کر اپنے مالک کا نقصان کیا ہو، تو ملازم ضامن بنے گا، اس پر ضمان لازم ہوگا۔

چنانچہ علامہ حصکفی فرماتے ہیں:

”ولا یضمن ما ھلك في یدہ أو بعملہ، کتحریق الثوب من دقہ، إلا إذا تعمد الفساد فیضمن کالمودع“۔(۱)

ترجمہ: اور ملازم ضامن نہ ہوگا اس کا جو چیز ہلاک ہوجائے، اس کے ہاتھ میں یا اس کے عمل سے، جیسے کپڑا مارنے سے پھٹ جانا، ہاں اگر جان بوجھ کر نقصان کیا، تو ضامن ہوگا جیسے مودع ہوتا ہے۔

ملازم کے لئے دفتری اشیاء اپنے ذات کے لئے استعمال کرنے کا حکم:

ملازم کو دفتر میں جو سہولیات ملتی ہیں، جو دفتری کام کے لئے ہی ہوتی ہیں، ملازم ان کو دفتری اوقات میں دفتری کام کے لئے ہی استعمال کرسکتا ہے، اپنے ذاتی کام کے لئے ہرگز استعمال نہیں کرسکتا، مثلاً فون کی سہولت، لیٹر پیڈ یا پین، کمپیوٹر وغیرہ کی سہولت، یا کوئی بھی ایسی چیز جو دفتری ضروریات کے لئے استعمال ہوتی ہوں، بلا اجازت ان اشیاء کو اپنے ذاتی استعمال میں نہ لائے۔

دفتر کی اسٹیشنری گھر استعمال کرنا

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

سوال: سرکاری ملازمین کو دفتروں میں جو اسٹیشنری ملتی ہے، کبھی کام کم ہونے کی وجہ سے پوری طرح سرکاری استعمال میں نہیں آسکتی، پھر دوسرے ماہ اور

(۱) الدر المختار: ۱۱۹/۹

سامان مل جاتا ہے، چنانچہ فاضل اسباب لوگ گھر لے جا کر بچوں کے استعمال میں دے دیتے ہیں، کیا یہ تمام اشیاء ملازمین کے ذاتی حقوق کے مد میں آتی ہیں اور ان کا ذاتی اور گھریلو استعمال اسلامی اصولوں کے مطابق جائز ہے، یا نہیں؟

جواب: سرکاری سامان کو گھر لے جانا درست نہیں ،الا یہ کہ سرکار کی طرف سے اس کی اجازت ہو۔(۱)

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

سوال: کمپنی ملازمین کو کوئی چیز دیتی ہے اور اختیار بھی ہوتا ہے مثلا لیٹر پیڈ، سرف وغیرہ کہ ایک مہینہ کے استعمال کے لئے خرچ کرو، ایک مہینہ کا سامان دیتی ہے، اگر وہ بچ جائے ،تو اسے ذاتی استعمال میں لا سکتے ہیں؟ ہمیں مکمل اختیار ہوتا ہے مہینہ گزر جانے کے بعد اور سامان آجاتا ہے، کیا یہ سامان ہمارے لئے جائز ہے؟ تفصیل سے جواب دیں۔

جواب: کمپنی کی طرف سے مقررہ وقت اور مقررہ کام کے لئے دی ہوئی چیزیں (لیٹر پیڈ سرف وغیرہ) میں سے باقی ماندہ اشیاء کو ذاتی استعمال میں لانے کے لئے کمپنی کی اجازت و رضامندی شامل ہو ،تو کوئی حرج نہیں ،استعمال جائز ہے۔(۲)

سرکاری ملازمین کا ایام رخصت کی تنخواہ لینے کا حکم:

عام طور پر سرکاری ملازمین جیسے اسکول و کالج کے سرکاری ملازمین یا دیگر سرکاری

(۱)آپ کے مسائل اور انکا حل(۸ /۱۴۹)

(۲)آپ کے مسائل اور ان کا حل جلد:۲/۱۲۳ مفتی نظام الدین شامزی

ملازمین کی سالانہ تعطیلات حکومت کی طرف سے مقرر ہوتی ہیں، ان ایام میں چھٹی کرنا یا رخصت لینا جائز ہے، ان مقررہ ایام سے زیادہ رخصت لینا یا بلا رخصت چھٹی کرنا اس کی قانونا اجازت نہیں ہوتی، لہذا اگر کوئی ملازم مقررہ ایام سے زیادہ چھٹی کرے، تو چھٹی کے دنوں کی تنخواہ لینا اس کے لئے حلال نہیں ہے، بعض ملازمین کسی مجبوری مثلا بارش بیماری یا موسم کی خرابی کی وجہ سے ڈیوٹی پر نہیں جاتے اور رجسٹر پر حاضری لگا دیتے ہیں، شرعا ان مقررہ ایام سے زائد چھٹی کی رخصت کر کے رجسٹر پر حاضری لگوانا یہ جھوٹ اور دھوکہ ہے اور ان ایام کی تنخواہ لینا بھی حلال نہیں ہے۔

اگر یہ ملازمین اپنے افسر بالا سے چھٹی لے بھی لیں تب بھی ان کے یہ رخصت کے ایام کی تنخواہ حلال نہیں ہے، عموما ایسے افسروں کو چھٹی دینے کا اختیار نہیں ہوتا، افسر کا اپنے ماتحت کو چھٹی دینا خلاف ضابطہ ہوگا، البتہ اگر افسر کو چھٹی دینے کا اختیار ہو، تو اس کا ملازم کو چھٹی دینا جائز ہوگا۔

اگر ملازم کسی عذر کی وجہ سے کوئی چھٹی کرے مثلا بیماری، یا فوتگی یا بارش کی وجہ سے، تو اگر اس نے رخصت لی ہو، تو رخصت کے ایام کی تنخواہ اس کے لئے حلال ہوگی اور اگر بغیر رخصت کے چھٹی کی ہو، تو ان دنوں کی تنخواہ اس کے لئے حلال نہیں ہے۔

ردالمحتار میں ہے:

"قوله (وإن لم يعمل) أي إذا تمكن من العمل، فلو سلم نفسه ولم يتمكن منه لعذر كمطر ونحوه لا أجر له كما في المعراج عن الذخيرة"۔(۱)

"قال أبو علي الدقاق : لايمنع في المصر من إتيان الجمعة و يسقط من الأجر بقدر اشتغاله إن كان بعيدا وإن قريبا لم يحط

---

(۱) رد المحتار: ۱۱۷/۹ ـ مبحث الاجير الخاص

شيء، فإن كان بعيدا، واشتغل ربع النهار يحط عنه ربع الأجرة"۔ (۱)

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

"اگر ملازمت کے شرائط میں یہ ہے کہ بلا تحصیل رخصت غیر حاضری پر تنخواہ وضع ہوگی، تو صورت مسئولہ میں تنخواہ وضع کی جائے گی، اگر شرائط میں کچھ مدت بلا تحصیل رخصت چھٹی پر رہنے اور حاضر نہ ہونے کی بھی موجود ہے، تو اس مدت کی تنخواہ وضع نہ ہوگی، غرض حسب شرائط عمل کیا جائے، جب کہ وہ موافق شرع ہوں۔ (۲)

تعطیلات کی تنخواہ:

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

سوال: [۱۹۶۸] ایک سرکاری ملازم کے لئے سرکاری تعطیلات کی تنخواہ لینا جائز ہے، یا نہیں؟ ضرور وضاحت فرمائیں، کیوں کہ اس ضمن میں غیر سرکاری ملازم لوگ مختلف خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔

جواب: سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ میں تعطیلات کے لئے جو قانون مقرر ہے، وہ اس ادارہ اور ادارہ کے ملازم کے درمیان معاہدہ کی شرائط کا درجہ رکھتا ہے، مثلاً ایک شخص کی تنخواہ ایک ہزار ہے اور مہینہ میں پانچ تعطیلات ہیں، تو گویا یہ ان ہی پچیس ایام کار کی تنخواہ ہے اور اسی کا دونوں کے درمیان معاہدہ ہے، نیز تعطیل کا مقصد بھی یہ ہوتا ہے کہ ملازم کو آرام اور اپنی دوسری

(۱) رد المحتار: ۱۱۹/۹ - مطلب ليس للأجير الخاص ان يصلي النافلة

(۲) فتاوی محمودیہ: ۵۷۶/۱۶

ضروریات کو پورا کرنے کا موقع بہم پہنچے، تاکہ اگلے دنوں تازہ دم ہوکر اور ذہنی یکسوئی کے ساتھ ادارہ کا کام کر سکے، پس تعطیل میں ملازم کا مفاد ہے، ایسے ہی ادارہ کا بھی مفاد ہے، اس لئے سرکاری ملازمین کے لئے سرکاری تعطیلات سے اور خانگی ملازمین کے لئے اس کمپنی کی مقررہ تعطیلات سے فائدہ اٹھانا جائز ہے اور ان ایام کی تنخواہ حلال ہے، فقہاء نے بھی ائمہ مساجد اور مدرسین کی ایام تعطیل کی تنخواہوں پر گفتگو کی ہے اور اس کا ماحاصل یہی ہے کہ عرف میں جتنے ایام تعطیل کے ہوتے ہیں ان ایام کی تنخواہیں دینا اور لینا دونوں جائز ہے۔(۱)

رخصت لینے کے لئے ملازم کا جعلی بیماری سرٹیفکیٹ پیش کرنا:

ملازم اگر واقعہ بیمار ہے، تو شرعا اور قانوتا اس کو رخصت لینے کی اجازت ہے، وہ رخصت لے سکتا ہے، بہت سارے سرکاری ملازمین بیماری کی جعلی سرٹیفکیٹ پیش کرکے رخصت لے لیتے ہیں، جب کہ وہ صحت مند ہوتے ہیں، اور ان ایام کی تنخواہ بھی لے لیتے ہیں، یاد رہے کہ بیماری کی رخصت یہ حکومت کی طرف سے ملازم کو ایک قسم کی چھوٹ ہے، جس سے مقصود بیمار ملازم کے لئے رعایت ہے، بیماری میں چھٹی کرنا یہ ملازم کا حق نہیں ہے، کیونکہ اصل یہی ہے کہ انسان جتنے دن کام کرے گا، اتنے دنوں کی تنخواہ کا مستحق ہوگا، لہذا فرضی یا جعلی سرٹیفکیٹ پیش کرکے رخصت لینا اور اس کی تنخواہ بھی لینا شرعا یہ جائز نہیں ہے، درحقیقت یہ ایک نہیں، بلکہ تین گناہوں کا مجموعہ ہے، جو ملازم بیک وقت کرتا ہے (۱) جھوٹ (۲) دھوکہ اور ناجائز طریقے پر پیسہ حاصل کرنا، جس کو قرآن نے ''اکل بالباطل'' قرار دیا ہے، اس لئے ملازمین کا یہ طرز عمل درست نہیں ہے اور جتنے دن ملازم جھوٹ بول کر چھٹی کرے

(۱) کتاب الفتاویٰ: ۴۰۳/۵ ۔تجارت سے متعلق سوالات

گا، اتنے دنوں کی تنخواہ اس کے لئے حلال نہیں ہے، ناجائز ہے، نیز ڈاکٹر جس نے جعلی بیماری کی سرٹیفکیٹ بنایا ہے، اس کو بھی گناہ ہوگا جھوٹ بولنے کا گناہ اور گناہ کے کام تعاون کرنے کا گناہ بھی ہوگا۔

دیر سے آنے والے ملازم سے پورے دن کی تنخواہ کاٹنا

بعض ادارے دیر سے آنے والے ملازمین یا چھٹی کرنے والوں سے ایک دن کی تنخواہ کاٹ لیتے ہیں، اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر متعلقہ کمپنی کی طرف سے مذکورہ طریقہ پر تنخواہ کٹنے کا اصول اور ضابطہ ہو اور ملازم کے شروع تقرری کے وقت ہی اس کو بتادیا جاتا ہو اور تنخواہ بھی یومیہ گھنٹوں کے اعتبار سے دی جاتی ہو، تو اس صورت میں جتنا بغیر اطلاع کے غیر حاضری ہو، اتنے وقت کی تنخواہ منہا کرلینا شرعاً جائز ہے اور درست ہے، اگر ایک یا دو یوم کی چھٹی بغیر اجازت کے کرے تو کمپنی والے ان دنوں کی تنخواہ کاٹ سکتے ہیں۔

البتہ یہ صورت جائز نہیں ہے کہ کم وقت کی غیر حاضری یا دیر سے آنے کی وجہ سے پورے دن کی تنخواہ کاٹ دی جائے جتنی دیر سے آیا ہے، اتنے وقت کی تنخواہ کاٹ سکتے ہیں، زیادہ وقت کی تنخواہ نہیں کاٹ سکتے، یہ کٹوتی جائز نہیں ہے، بلکہ تعزیر مالی ہونے کی بناء پر ممنوع ہے جس سے احتراز لازم ہے۔

فتاوی شامی میں ہے:

"قال أبو علی الدقاق : لایمنع فی المصر من إتیان الجمعة و یسقط من الأجر بقدر اشتغاله إن کان بعیدا وإن قریبا لم یحط شیء فإن کان بعیدا واشتغل ربع النهار یحط عنه ربع الأجرة"۔(۱)

(۱) رد المحتار:۹/۱۱۹۔مطلب لیس للاجیر الخاص ان یصلی النافلة

غیر حاضریاں کرنے والے ماسٹر کو پوری تنخواہ لینا:

سوال: ایک صاحب علم آدمی ایک اسکول میں ماسٹر ہے، مگر وہ اپنے علاقہ کے لوگوں کے معاملات میں اس قدر مصروف ہے کہ باقاعدگی سے اسے اسکول میں حاضری کا موقع نہیں ملا کرتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ مہینے میں کوئی ۱۷۔۱۸ حاضریاں اس کی بنیں گی، تو کیا اس کو اس بناء پر پوری تنخواہ اصول کرنا جائز ہو گا کہ وہ خدمت خلق اور لوگوں کے کاموں میں مصروف ہے، جبکہ اسکول میں ایسا دوسرا ماسٹر موجود ہو، جو اس کے پیریڈ لے سکے؟

جواب: ماسٹر صاحب کو تنخواہ تو پڑھانے کی ملتی ہے، خدمت خلق کی نہیں ملتی، اس لئے وہ کتنی پڑھائی کریں، بس اتنی ہی تنخواہ کے مستحق ہیں، اس سے زیادہ ناجائز لیتے ہیں۔(۱)

تاخیر سے تنخواہ دینا:

مستاجر کے ذمے لازم ہے کہ مہینہ پورا ہوتے ہی ملازم یا نوکر کو اس کی تنخواہ دی جائے، تنخواہ بلا عذر شرعی لیٹ نہ کی جائے، بہت سارے اداروں میں تنخواہ کی ادائیگی کے لئے تاریخ مقرر ہوتی ہے، مقررہ تاریخ سے لیٹ کرنا مناسب نہیں ہے، اگر عذر ہے تو کوئی حرج نہیں، بلا عذر ایسا کرنا مذموم اور قابل اصلاح ہے۔

کافر کی ملازمت کرنا یا کافر کو ملازم رکھنا

پہلا مسئلہ کافر کو ملازم رکھنا کیسا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شرعاً انعقاد اجارہ کے لئے

(۱) آپ کے مسائل اور انکا حل:۸ /۲۸۸

عاقد کا مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے، لہٰذا عقد اجارہ مسلمان، ذمی، حربی، مستامن کے ساتھ کرنا جائز ہے۔ چنانچہ بدائع میں ہے:

"وإسلامه ليس بشرط أصلاً فتجوز الإجارة من المسلم و الذمي والحربي والمستأمن، لأن هذا من عقود المعاوضات، فيملكه المسلم والكافر جميعاً"۔ (۱)

ترجمہ: اسلام شرط نہیں ہے، پس اجارہ جائز ہے مسلمان سے، حربی سے اور مستامن سے، کیونکہ یہ اجارہ عقود معاوضہ میں سے ہے پس مسلمان اور حربی دونوں اس کو کر سکتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ کافر کو ملازم رکھا جا سکتا ہے، شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے موقع پر کافر جو مشرک تھا، اس کو راستہ کی رہبری کے لئے ملازم رکھا تھا جیسے پہلے باحوالہ گزر چکا ہے۔

جس طرح کفار کے ممالک سے تجارت کرنا، اور کفار کے ہاتھ اشیاء فروخت کرنا جائز ہے، اسی طرح کافروں کے ہاں ملازمت کرنا بھی جائز ہے۔

کافر اور مشرک کو ملازم رکھنے کے لئے امام بخاریؒ کے ہاں دو شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱)...... پہلی یہ کہ ضرورت ہو۔

۲)...... دوسری یہ کہ اس کام کو انجام دینے کے لئے کوئی مسلمان میسر نہ ہو۔

لیکن جمہور علماء کے نزدیک نہ یہ ضروری ہے کہ بہت ہی سخت ضرورت ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کام کے لئے کوئی مسلمان میسر نہ ہو، بلکہ اگر مسلمان ہو، تب بھی اگر کسی مشرک یا کافر کو ملازم رکھ لیا جائے، تو یہ جائز ہے۔

---

(۱) بدائع الصنائع: ۴/ ۱۹

چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے:

"وإسلامه ليس بشرط أصلاً، فتجوز الإجاره والاستئجار من المسلم والذمي والحربي والمستامن"۔(۱)

ترجمہ: اجارہ استیجار، مسلمان، ذمی، حربی (کافر اصلی) اور مستامن سب کے ساتھ جائز ہے۔

لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ مسلمان کافر کے ہاں ایسی ملازمت کر رہا ہو جو شرعا جائز ہو، اگر ایسا کام ہو جو شرعا ناجائز ہو، مثلاً سود، شراب کی لین دین، بیمہ کمپنی، خنزیر وغیرہ کے متعلق ملازمت ہو، تو ایسی ملازمت کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، ایسی ملازمت حرام ہے اور اس سے حاصل ہونے والی تنخواہ بھی حرام ہی ہوگی۔

کفار کی ملازمت کرنا درست ہے یا نہیں

جامع الفتاویٰ میں ہے:

سوال: کفار کی ملازمت کرنا درست ہے یا نہیں؟

جواب: کفار کی ملازمت کی تین قسمیں ہیں:

(۱) بلا کراہت جائز ہے، مثلاً حقوق کے ثابت کرنے، شر و فساد کے دفع کرنے، چور اور ڈاکوؤں سے حفاظت کرنے، پل، مہمان سرائے، اور دیگر مفید عمارتوں کے بنانے کے لئے ملازمت کی جائے، جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے بادشاہ وقت سے جو کافر تھا، خزانہ مصر کا داروغہ بننے کی درخواست کی تھی، تا کہ عدل و انصاف کر سکیں اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے حضرت موسیٰ کو دودھ پلانے کے لئے فرعون کی ملازمت کی تھی۔

(۱) الفتاوی الهندیه: ٤ /٤٦١

(۲) کراہت کے ساتھ جائز ہے، مثلاً ایسی نوکری کرنا جس میں کفار کے سامنے کھڑے رہنا اور تعظیم کرنا لازمی اور ضروری ہو کہ جس سے مسلمانوں کی بے عزتی ہو، اور ہتک شان متصور ہوتی ہو، جیسے سر رشتے داری وغیرہ۔

(۳) حرام ہے، مثلاً معاصی منہیات، وممنوعات شرعیہ پر ملازمت کرنا، جیسا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں جانے والی فوج اور پولیس میں ملازمت کرنا۔(۱)

قاعدہ نمبر ۸:

ہر معاملہ کرتے وقت متعاقدین کے اندر اہلیت کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح عقد اجارہ میں بھی اجیر کے اندر اہلیت کا ہونا ضروری ہے، فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق اہلیت سے مقصود یہ ہے کہ اجیر عاقل ہو، یعنی اس میں اتنی سمجھ بوجھ کا ہونا ضروری ہے، جس سے وہ اچھے برے اور نفع ونقصان کی تمیز کر سکے...... ایسا سمجھدار بچہ اگر عقد اجارہ کرے گا، تو اس وقت دیکھا جائے گا کہ اس بچے کو ولی (سرپرست) کی جانب سے عقد کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ اگر اس بچے کو ولی کی جانب سے عقد کرنے کی اجازت ہے، تو بچہ کا یہ عقد شرعاً نافذ سمجھا جائے گا اور اگر ولی کی جانب سے اس بچے کو عقد کرنے کی اجازت نہ ہو اور پھر بچہ نے یہ عقد کر لیا ہو، تو پھر معاملہ ولی کی اجازت پر موقوف ہوگا، اگر ولی نے اجازت دے دی، تو عقد نافذ سمجھا جائے گا، ورنہ نافذ نہیں سمجھا جائے گا، چنانچہ بالغ ہونا کوئی ضروری نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ مجنون اور ناسمجھ بچہ کے عقد کرنے کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے۔

شیخ خالد اتاسی شرح المجلہ میں فرماتے ہیں:

"يشترط في انعقاد الإجارة أهلية العاقدين، يعني كونهما

(۱) جامع الفتاویٰ: ۳/۳۹۸۔ ط مکتبہ رحمانیہ مفتی مہربان علی شاہ

عاقلين مميزين ، حتى لا تنعقد الإجارة المجنون والصبي الذي لا يعقل ، وأما البلوغ فليس من شرائط الانعقاد ، ولا من شرائط النفاذ عندنا، حتى إن الصبي العاقل لو آجر ماله أو نفسه، فإن كان مأذونا تنفذ ، وإن كان محجورا تتوقف على إجازة الولي عندنا"۔(۱)

ترجمہ: انعقادِ اجارہ کے لئے عاقدین کی اہلیت شرط ہے، یعنی عاقدین کا عاقل اور ممیز ہونا ضروری ہے، یہاں تک کہ مجنون اور بچہ جو کہ بالکل ناسمجھ ہو اس کا اجارہ منعقد نہیں ہوتا، اور حنفیہ کے نزدیک بلوغ کا تعلق شرط نفاذ سے ہے، نہ کہ شرط انعقاد سے، یہاں تک کہ اگر کوئی بچہ جو سمجھدار ہے، اگر وہ اپنے آپ کو یا اپنے مال کو اجارہ پر دینا چاہے، تو ماذون ہونے کی صورت میں اس کا یہ عقد نافذ ہو جائے گا اور محجور ہونیکی صورت میں ولی کی اجازت پر موقوف رہے گا۔

مسلمان کے لئے غیر مسلم حکومت کے اداروں میں ملازمت کرنا؟

فقہی مقالات میں ہے:

سوال: کسی مسلمان کے لئے امریکہ یا کسی بھی غیر مسلم حکومت کے سرکاری محکمے میں ملازمت کرنا جائز ہے؟ جس میں ایٹمی توانائی کے محکمے اور جنگی حکمت عملی کے تحقیقی ادارے بھی شامل ہیں؟

جواب: امریکی حکومت یا دوسری غیر مسلم حکومتوں کے سرکاری محکموں میں ملازمت اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس طرح ایٹمی توانائی کے محکمے میں

(۱) شرح المجلة: ۲/ ۵۲۶

اور جنگی حکمت عملی کے تحقیقی ادارے میں بھی کام کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر اس کے ذمے کوئی ایسا عمل سپرد کیا جائے جس میں کسی بھی ملک یا شہر کے عام مسلمانوں کو ضرر لاحق ہوتا ہو، تو اس عمل سے اجتناب کرنا لازمی ہے، چاہے اس کیلئے اس کو اپنی ملازمت سے استعفاء ہی کیوں نہ دینا پڑے۔(۱)

مسلمان کا غیر مسلم یا مرتد کے پاس نوکری کرنا:

سوال: کیا مسلمان کسی غیر مسلم یا مرتد کے پاس نوکری کر سکتا ہے، جبکہ وہ جائز اور قانونی کاروبار کرتا ہے اور ایمانداری سے کرتا ہے؟

جواب: مرتد کے پاس نوکری جائز نہیں، دوسرے غیر مسلموں کے پاس نوکری جائز ہے۔(۲)

گھریلو ضرورت کے لئے عیسائی عورت کو ملازمہ رکھنا:

غیر مسلموں کو گھر میں خدمت کیے لئے بطور ملازم رکھنا اور ان سے گھر کا کام کاج لینا شرعا جائز اور درست ہے، ان سے کھانا پکوانا، اور گھر، برتن، کپڑے وغیرہ دھلوانا بھی جائز ہے، بشرطیکہ وہ پاکی وناپاکی کا خیال رکھتے ہوں، اس میں زیادہ بہتر صورت تو یہ ہے کہ اگر غریب گھرانے کی کوئی مسلمان باپردہ عورت مل جائے، تو وہ زیادہ بہتر ہے، ایک تو اس کو روزگار فراہم کرنے کا ثواب اور دوسرا اپنی ضرورت بھی پوری ہوگی۔

گھریلو خادمہ پر ضمان نہیں:

گھر کی خادمہ سے اگر گھر کی صفائی کے دوران کوئی قیمتی چیز گر کر ٹوٹ جائے، یا ضائع ہو

(۱) فقهی مقالات: ۱/۲۶۲

(۲) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۸/۱۷۷

جائے، تو اس پر کوئی تاوان لازم نہیں آتا، وجہ یہ ہے کہ گھر کی خادمہ یا خادم کو شریعت کی اصطلاح میں اجیر خاص کہا جاتا ہے اور اس کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر بغیر قصد و ارادہ کے کوئی چیز اس سے اتفاقاً ضائع ہو جائے، تو اس پر تاوان لازم نہیں آتا۔

یہی حکم ان تمام ملازمین کا ہے جو کسی محکمے میں کام کرتے ہوں، یا کسی دکان وغیرہ پر ملازمت کرتے ہوں، سب کا یہی حکم ہے، ان پر تاوان لازم نہیں آئے گا، البتہ اگر قصداً یا ارادۃً ایسا کیا ہو، تو تاوان لازم ہوگا۔

مجمع الضمانات میں ہے:

”ولا ضمان على الأجير الخاص، ولا فيما تلف من عمله اتفاقا، إذا لم يتعمد الفساد، ذكره في الإصلاح عن الفصولين نقلا عن التجريد: الأجير الخاص لا ي بالتعدي“۔(۱)

ترجمہ: اور اجیر خاص (ملازم) پر ضمان نہیں ہوگا اور نہ اس میں جو چیز ان سے اتفاقاً ضائع ہو گئی ہو، جب جان بوجھ کر فساد نہ کیا ہو، تجرید کے حوالے سے فصول میں نقل کیا ہے کہ اجیر خاص ضامن نہیں بنتا مگر تعدی کے ساتھ۔

کیا شیعہ، قادیانی وغیرہ کو ملازم رکھا جا سکتا ہے

اگر شیعہ ایسا ہو کہ جس سے سنیوں کو کسی قسم کے نقصان اور ضرر کا اندیشہ نہ ہو، تو شیعہ کو بھی ملازم رکھ سکتے ہیں، لیکن بہتر یہ ہے کہ کسی سنی راسخ العقیدہ شخص کو ہی ملازم رکھا جائے، اگر اس کو کوئی سنی نہ جانتا ہو، تو شیعہ کو بھی ملازم رکھ سکتے ہیں، چنانچہ فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

سوال [۸۱۱۱] ایک شخص کو قبرستان میں ملازم رکھا ہے حفاظت کے لئے، بعد

(۱) مجمع الضمانات: (ص:۵۲) الباب الخامس مسائل الاجارہ۔ط بیروت

میں معلوم ہوا کہ وہ شیعہ ہے، مگر معاملات بہت صاف ہیں، حفاظت خوب کرتا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے آدمی کو رکھنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر اس سے کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہیں، تو اس کو ملازم رکھنا درست ہے، اگر کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ ہے، یا احتمال ہے کہ سنیوں کی قبروں کا احترام نہیں کرے گا، بلکہ بے حرمتی کرے گا تو اس کو ملازم رکھنا درست نہیں، تاہم اس سے بہتر اچھے عقائد کا آدمی مل جائے، تو اس کو رکھنا زیادہ اچھا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم (۱)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"لا بأس بأن يكون بين المسلم والذمي معاملة إذا كان مما لابد منه"۔ (۲)

کوئی حرج نہیں کہ مسلمان اور ذمی کے درمیان کوئی معاملہ ہو، جب اس کے بغیر چارہ نہ ہو۔

البتہ حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ نے شیعہ، قادیانی، ذکری وغیرہ کے ملازم رکھنے کو ناجائز قرار دیا ہے، کیونکہ یہ لوگ عام کفار سے سخت ہیں، ان کے ساتھ کسی قسم کا معاملہ کرنا جائز نہیں ہے، البتہ ضرورت شدیدہ کی بناء پر ان کو ملازم رکھنا جائز ہے۔

چنانچہ مفتی رشید احمد لدھیانویؒ لکھتے ہیں:

اگر کسی نے ان کے ساتھ کوئی معاملہ بیع یا اجارہ وغیرہ کر لیا تو منعقد نہیں ہوگا، البتہ صاحبینؒ کے ہاں عدم جواز کے باوجود عقد نافذ ہو جائے گا، بوقت ابتلاء عام وضرورت شدیدہ اس قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ جدید: ۱۶/۵۷۸

(۲) فتاویٰ عالمگیری الباب الرابع عشر فی اھل الذمة، کتاب الکراهية: ۵/۳۴۸

(۳) احسن الفتاویٰ: ۸/۲۵۰

صلاحیت کا معیار اور ملازم کی اقسام:

ملازم (اجیر) دو طرح کے ہوتے ہیں:

۱)......ایک انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے یعنی جن کا کام ذہنی محنت، تنظیم اور منصوبہ بندی ہے۔

۲)......دوسرے جسمانی محنت کرنے والے جنہیں عرف عام میں مزدور کہا جاتا ہے۔

قرآن حکیم نے ان دونوں طرح کے کارکنوں کی صلاحیت کا معیار اصولی طور پر بتا دیا ہے۔

پہلی قسم کے مزدور کی صلاحیت کا معیار:

قسم اول کا معیار سورہ یوسف میں سامنے آتا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکبازی اور امانت داری اہل دربار اور بادشاہ مصر پر روز روشن کی طرح واضح ہوگئی، تو بادشاہ نے حکم دیا کہ انہیں میرے پاس لایا جائے، تاکہ میں ان کو اپنے (سرکاری کاموں کے لئے) خاص کرلوں، آپ کو اعزاز کے ساتھ جیل خانے سے لایا گیا، اور باہمی گفتگو سے یوسف علیہ السلام کی صلاحیتوں کا مزید اندازہ ہوگیا تو بادشاہ نے کہا:

﴿ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ﴾ (۱)

ترجمہ: آج سے تم ہمارے ہاں بڑے معزز اور امانتدار ہو۔

پھر بادشاہ نے اپنے خواب کی تعبیر آپ سے براہ راست تفصیل سے سنی اور پوچھا کہ اتنے بڑے سات سالہ قحط میں معاشی و مالیاتی امور کا انتظام اور منصوبہ بندی بڑا بھاری کام ہے، یہ انتظام کس کے سپرد کیا جائے، آپ نے فرمایا:

---

(۱) سورہ یوسف، آیت: ۵۴

﴿ اِجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ ﴾(۱)

مجھے ملکی خزانوں پر مقرر کر دیجئے میں (ان کی) حفاظت بھی کر سکتا ہوں اور (آمد و خرچ کے انتظام اور اس کے حساب و کتاب کے طریقوں سے بھی) خوب واقف ہوں۔

قرآن حکیم نے تین لفظوں (۱) امین (۲) حفیظ (۳) علیم میں ان تمام اوصاف کو جمع کر دیا ہے جو ایک انتظامی عہدہ دار خصوصاً مالیاتی امور کے منتظم میں ہونی چاہئیں، کیونکہ سب سے پہلی ضرورت تو اس کی ہے کہ وہ:

''امین'' یعنی امانت دار ہو، جس میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ قول و فعل کا سچا ہو، اور اپنے فرائض منصبی کو دیانداری، خیر خواہی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ ادا کرنے میں دانستہ کوتاہی کرنے والا نہ ہو۔

دوسری ضرورت یہ ہے کہ وہ ''حفیظ'' یعنی حفاظت کرنے والا ہو کہ اپنے زیر انتظام وسائل، اموال اور ساز و سامان کو ضائع اور خراب نہ ہونے دے، اور فرائض منصبی کے سلسلے میں جو راز اس کے پاس آئیں، ان کی بھی پوری حفاظت کر سکے۔

تیسری ضرورت اس کی ہے کہ وہ ''علیم'' ہو یعنی فرائض منصبی کے لئے جن علوم و فنون کی ضرورت ہے، ان کا حامل ہو، وسائل اور اموال کو جہاں جس قدر خرچ کرنا ضروری ہے، اس کا صحیح اندازہ کر سکے، تاکہ ضرورت کے مواقع میں کوتاہی نہ کرے اور مقدار ضرورت سے زائد خرچ نہ کرے۔

خلاصہ یہ کہ قسم اول یعنی انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے کارکنوں اور عہدہ داروں کے لئے صلاحیت کا معیار یہ ہے کہ وہ (۱) امانتدار (۲) حفاظت کرنے والے اور (۳) متعلقہ فنون و علوم کے حامل ہوں۔

---

(۱) سورہ یوسف، آیت: ۵۵

قسم دوم کے ملازم کی صلاحیت کا معیار

اور قسم دوم کے کارکنوں یعنی جسمانی محنت کرنے والوں کا معیار صلاحیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں بیان ہوا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی ایک صاحبزادی نے اپنے والد بزرگوار کو مشورہ دیا کہ

﴿ یَا اَبَتِ اسۡتَاۡجِرۡهُ ، اِنَّ خَیۡرَ مَنِ اسۡتَاۡجَرۡتَ الۡقَوِیُّ الۡاَمِیۡنُ ﴾(۱)

ترجمہ: ابا جان (آپ کو آدمی کی ضرورت ہے) آپ ان (موسیٰ علیہ السلام) کو نوکر رکھ لیجئے کیونکہ بہتر نوکر وہ ہے جو مضبوط اور امانتدار ہو۔

ان صاحبزادی کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے بڑی حکمت کی بات جاری فرمائی، جس کا حاصل یہ ہے کہ بہتر اجیر وہ ہے جس میں دو صفات ہوں، ایک کام کی قوت وصلاحیت ہو، دوسرے امانتداری ہو، معلوم ہوا کہ مطلوبہ جسمانی قوت اور امانتداری کے بغیر کوئی اجیر اچھا اجیر نہیں ہوسکتا۔

یہاں یہ بات خصوصی توجہ کی طالب ہے کہ دونوں قسم کے کارکنوں کی باقی مطلوبہ صفات تو مختلف ہیں، لیکن امانتداری کی صفت کو دونوں جگہ معیار کے طور پر ذکر فرمایا گیا ہے، معلوم ہوا کہ امانتداری ہر قسم کے کارکن، عہدیدار، ملازم اور مزدور میں ہونی ضروری ہے، قرآن وسنت میں امانتداری کی جگہ جگہ بڑی تاکید آئی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایسا کم ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں کوئی خطبہ دیا ہو اور اس میں یہ ارشاد نہ فرمایا ہو کہ

"لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ"۔(۲)

ترجمہ: جس میں امانتداری نہیں اس میں ایمان نہیں، اور جس میں معاہدے کی

---

(۱) سورة القصص، آیت:۲۶

(۲) شرح السنه للشيخ الحسين ابن مسعود: ۱/۷۵

پابندی نہیں اس میں دین نہیں۔

آنحضرت ﷺ نے منافق کی تین علامتیں بیان فرمائی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

"وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ"۔(۱)

ترجمہ: جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

آج کل عہدوں اور ملازمتوں کے لئے دوسری صلاحیتوں اور ڈگریوں کو تو دیکھا جاتا ہے، مگر دیانت وامانت کی طرف توجہ نہیں کی جاتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ رشوت خوری، اقرباء پروری، کام چوری، احساس ذمہ داری کے فقدان اور طرح طرح کی بدعنوانیوں کے باعث ہمارے سرکاری اداروں میں کارگردگی کا کوئی معیار باقی نہیں رہا اور تجارتی وصنعتی اداروں میں بھی ہر معیار تیزی سے گر رہا ہے، تجارت دنیا بھر میں بدنامی کا سامنا کر رہی ہے۔

ہمارے سرکاری تعلیمی ادارے اور ذرائع ابلاغ نہ صرف یہ کہ امانت ودیانتداری کو پروان نہیں چڑھا رہے ہیں، بلکہ رہی سہی امانت ودیانت کا بھی بیج مار دینے پر تلے نظر آتے ہیں، پھر کرپشن ہی ہماری شناخت بن کر رہ گئی ہے، تو تعجب کیوں ہو؟

علامہ یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

"ملازمت کے ذریعہ روزی کمانا مسلمان کے لئے جائز ہے، خواہ ملازمت حکومت کے ماتحت ہو، یا کسی ادارہ یا شخص کے ماتحت، بشرطیکہ وہ متعلقہ کام کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اپنے فرائض ادا کر سکتا ہو۔ البتہ کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ جس کام کی اہلیت نہیں رکھتا، اس کا امیدوار بن جائے، خصوصاً جب کہ وہ منصب حکومت یا عدالت سے متعلق ہو، ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

"ویل للأمراء، ویل للعرفاءِ، ویل للأمناء، لیتمنین أقوام یوم

---

(۱) بخاری، کتاب الایمان، باب علامة المنافق: (۲/۱۰) دار الحدیث

القيمة إن ذوائبهم معلقة بالثريا يدلون بين السماء والأرض وإنهم لم يعلوا عملا"۔ (۱)

ترجمہ: تباہی ہے امراء کے لئے، تباہی ہے سربراہوں کے لئے، اور تباہی ہے خازنوں کے لئے، کتنے ہی لوگ قیامت کے دن تمنا کریں گے کہ کاش ان کی چوٹیاں ثریا سے باندھ دی جاتیں اور وہ آسمان وزمین کے درمیان لٹکا دئے جاتے، لیکن انہیں صاحب اختیار نہ بنایا جاتا۔ (۲)

کوٹہ سسٹم کے بجائے صلاحیت

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ اسلام میں ملازمت اور مزدوری میں کوٹے (Quata) کا اصول نہیں، بلکہ جیسا کہ آگے کی آیات واحادیث سے مزید وضاحت ہو جائے گی، مدار اہلیت وصلاحیت پر رکھا گیا ہے، یہ نہیں ہے کہ کوئی نااہل آدمی آ کر مطالبہ کرے:

"میں چونکہ فلاں علاقے کا باشندہ ہوں، اس لئے مجھے فلاں ملازمت پر ضرور لگائے، ورنہ آپ ظالم ہوں گے"۔

آج کل جو کوٹہ سسٹم پاکستان کے بعض علاقوں میں رائج اور نافذ ہے کہ مختلف علاقوں کے لئے ملازمتوں کے کوٹے مقرر ہیں، ایک علاقے کے کوٹے میں دوسرے علاقے کا آدمی نہیں رکھا جاسکتا، اگرچہ وہ کتنا ہی قابل اور امین کیوں نہ ہو، اور اس علاقے کا آدمی کتنا ہی غلط کار، نااہل ہو، اسلام میں اس کا کوئی تصور نہیں، اگر کوئی شخص صلاحیت میں دوسرے امیدواروں کے مقابلے میں ناقص ہے، تو پھر یہ ناانصافی کی بات ہے کہ وہ پھر بھی اسی جگہ ملازمت پر اصرار کرے، دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کے بجائے کوئی دوسرا کام

(۱) صحیح ابن حبان: ۳۳۵/۱۰

(۲) اسلام میں حلال وحرام: (ص: ۱۹۷) ط مکتبہ اسلامیہ)

دیکھے۔

متعلقہ سرکاری حکام پر اور نجی شعبے کے ان تمام با اختیار ذمہ داروں پر بھی جو اپنے اداروں کے تنہاء مالک نہیں شرعاً لازم ہے کہ وہ ساری تقرریاں اہلیت وامانتداری ہی کی بنیاد پر کریں، خواہ امیدوار کسی بھی علاقے کا باشندہ ہو، اوپر کی مثالوں میں بھی حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کا وزیر خزانہ بنایا گیا (بعد میں تو سارے شاہی اختیارات بھی انہی کی طرف منتقل کر دیئے گئے) حالانکہ مصر ان کا وطن اصلی نہ تھا۔

اور موسیٰ علیہ السلام کو مدین میں ملازمت ملی، جب کہ ان کا وطن مصر تھا، خلاصہ یہ کہ تقرر کرنے والے حکام اور افسران کا دینی فریضہ ہے کہ وہ مقامی اور غیر مقامی کے امتیاز کے بغیر ساری تقرریوں میں اہلیت وامانتداری کو ہی معیار بنائیں۔ ذاتی مفادات، ذاتی پسند یا کسی قسم کے تعصبات یا کسی کے سفارش کو اس اہم فریضے کی ادائیگی میں حائل نہ ہونے دیں گے، اس لئے کہ تقرر کرنے کا یہ اختیار بھی ایک امانت ہے، اس میں خیانت کرنا اور باصلاحیت لوگوں کے ہوتے ہوئے نااہلوں کو مسلط کر دینا ان تمام لوگوں پر ظلم ہے جن کے حقوق اس ادارے سے وابستہ ہیں، اس سلسلے میں قرآن وسنت کی چند ہدایات یہ ہیں

قرآن حکیم کا فرمان ہے کہ:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾(۱)

ترجمہ: بلا شبہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کو ان کی امانتیں پہنچادو۔

اس آیت کا نزول ایک اہم عہدہ سپرد کرنے ہی کے واقعے میں ہوا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کعبہ مکرمہ کی خدمت کو اسلام سے پہلے بھی بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا، چنانچہ بیت اللہ کی مختلف خدمتیں باصلاحیت لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھیں، اور جو لوگ بیت اللہ کے کسی خاص خدمت کے لئے منتخب ہوتے تھے، وہ پوری قوم میں معزز وممتاز سمجھے جاتے تھے، زمانہ

(۱) سورہ نساء، آیت: ۵۸

جاہلیت سے ایام حج میں حجاج کو زمزم پلانے کی خدمت آنحضرت کے چچا حضرت عباسؓ کے سپرد تھی، جس کو "سقایہ" کہا جاتا تھا، بعض خدمتیں آنحضرت ﷺ کے دوسرے چچا ابو طالب کے سپرد تھیں، اسی طرح بیت اللہ کی کنجی رکھنا اور مقررہ ایام میں کھولنا، بند کرنا عثمان ابن طلحہؓ سے متعلق تھا۔

حضرت عثمان ابن طلحہؓ کا اپنا بیان ہے کہ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلا کر بیت اللہ کی کنجی طلب فرمائی۔ آپ ﷺ بیت اللہ میں تشریف لے گئے، اور ہاں نماز پڑھ کر باہر تشریف لائے، تو کنجی مجھے واپس کرتے ہوئے فرمایا: لو اب یہ کنجی ہمیشہ سے تمہارے ہی خاندان کے پاس رہے گی، جو شخص تم سے یہ کنجی واپس لے گا وہ ظالم ہوگا اور ساتھ ہی یہ بھی ہدایت فرمائی کہ بیت اللہ کی اس خدمت کے صلے میں تمہیں جو مال مل جائے، اسے شرعی قاعدے کے موافق استعمال کرو۔

حضرت فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں کہ اس روز جب آنحضرت ﷺ بیت اللہ سے باہر تشریف لائے، تو یہ آیت کبھی آپ سے نہیں سنی تھی، ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت اسی وقت کعبہ میں نازل ہوئی تھی، اسی آیت کی تعمیل میں آنحضرت ﷺ نے دوبارہ عثمان بن طلحہؓ کو بلا کر کنجی ان کے سپرد فرمائی (جس سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمان ابن طلحہ ہی اس منصب کے اہل اور مستحق تھے)۔

اور اس پہ سب کا اتفاق ہے کہ آیت کا شان نزول اگر چہ کوئی خاص واقعہ ہوا کرتا ہے، لیکن حکم عام ہوتا ہے، جس کی پابندی پوری امت کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

اس جگہ یہ بات غور طلب ہے کہ قرآن حکیم نے یہاں لفظ "امانات" استعمال فرمایا ہے، جو امانت کی جمع ہے، اس میں اشارہ ہے کہ امانت صرف یہی نہیں کہ کسی کا کوئی مال کسی کے پاس رکھا ہو، جس کو عام طور پر امانت کہا اور سمجھا جاتا ہے، بلکہ امانت کی کچھ اور بھی قسمیں ہیں، جو احادیث میں بیان کی گئی ہیں، مثلاً مشورے کا امانت ہونا اور راز کا امانت ہونا وغیرہ، جو واقعہ آیت کے نزول کا بھی ذکر کیا گیا، خود اس میں بھی کوئی مالی امانت نہیں، بیت اللہ کی

کنجی کوئی مال نہ تھا، بلکہ یہ کنجی خدمت بیت اللہ کے ایک عہدے کی نشانی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ منصب اور عہدے جتنے ہیں، وہ سب اللہ کی امانتیں ہیں، جس کے امین وہ حکام اور افسران ہیں، جن کے ہاتھ میں تقرر اور معزول کرنے کے اختیارات ہیں، جس طرح امانت صرف اسی کو ادا کرنی چاہئے، جو اس کا مالک ہے، کسی فقیر مسکین پر رحم کھا کر دوسرے کی امانت اس کو دے دینا جائز نہیں۔

اسی طرح حکومت اور مشترک اداروں کے عہدے بھی امانتیں ہیں اور ان امانتوں کے مستحق صرف وہی لوگ ہیں جو اپنی صلاحیت کار اور قابلیت میں بھی اس عہدے کے لئے مناسب اور موجودہ لوگوں میں سب سے بہتر ہوں اور دیانت وامانتداری میں بھی ان پر فوقیت رکھتے ہوں، ان کے سوا کسی اور کو یہ عہدہ سپرد کر دینا خیانت ہے۔

چنانچہ جب حضرت ابوذر غفاریؓ نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے بھی کسی جگہ کا حاکم مقرر فرمالیں، تو آپ ﷺ نے یہ کہہ کر انکار فرمایا کہ

"یاأباذر! إنك ضعيف، وإنها أمانة، وإنها يوم القيامة خزى و ندامة، إلا من أخذها بحقها وأدى الذى عليه فيها"۔ (۱)

ترجمہ: اے ابوذر: آپ ضعیف ہیں اور منصب ایک امانت ہے جس کی وجہ سے قیامت کے دن انتہائی ذلت ورسوائی ہوگی، سوائے اس شخص کے جس نے امانت کا حق پورا کر دیا ہو (یعنی وہ ذلت سے بچ جائے گا)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"من استعمل رجلا من عصابة وفيهم من هو أرضى الله منه فقد خان الله ورسوله والمومنين"۔(۲)

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الإمارة، رقم الحديث: ٤٦٨٤

(۲) الترغيب والترهيب: ٣/٤٦٢

ترجمہ: جس نے کچھ لوگوں میں سے کسی ایسے شخص کو کوئی عہدہ سپرد کر دیا جس سے بہتر آدمی ان میں موجود تھا تو اس نے اللہ کی خیانت کی اور اس کے رسول کی اور سب مسلمانوں کی خیانت کی۔

آج جہاں سرکاری اور نجی اداروں میں نظام کی ابتری نظر آتی ہے، وہ سب قرآن وسنت کی اس تعلیم کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے، کہ تعلقات، سفارشوں اور رشوتوں سے عہدے تقسیم کئے جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نا اہل لوگ عہدوں پر قابض ہو کر خلق خدا کو پریشان کرتے ہیں، اور سارا نظام برباد ہو جاتا ہے اور معاشرہ ظلم وفساد سے بھر جاتا ہے، اسی لئے جب ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا ''قیامت کب آئے گی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"إذا ضيعت الأمانة فانتظر الساعة"۔(۱)

جب امانت کو ضائع کر دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔

معلوم ہوا کہ نا اہلوں کو عہدوں پر مسلط کر دینا ایسی خطرناک اور دور رس خیانت ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اصلاح فساد کی توقع بے سود ہے، صرف قیامت ہی کا انتظار کیا جا سکتا ہے۔

ہاں! اگر کوئی شخص کسی ادارے کا تنہاء مالک ہے، وہ اپنی مرضی سے یا کمپنی کے تمام شرکاء باہمی رضاء مندی سے کسی بے صلاحیت آدمی کو مالی امداد پہنچانے کے لئے ملازم رکھ لیں، تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، کیونکہ یہ ان کا خالص ذاتی معاملہ ہے اور اپنی ذاتی ملکیت تک محدود ہے، جس کا ضرر کسی اور کو لاحق نہیں ہوتا، پھر اس میں ایک کمزور ونادار انسان کی ایسی مالی اعانت ہے جس سے اس کی عزت نفس اور خودداری بھی محفوظ رہتی ہے، ایسا احسان وایثار کا معاملہ شرعاً پسندیدہ ہے اور ملازم رکھنے والوں کے لئے بھی خیر وبرکت کا باعث ہے،

---

(۱) صحيح البخاري، رقم الحديث: ۵۹

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

"إنما ترزقون و تنصرون بضعفائكم"۔(۱)

ترجمہ: تم کو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) رزق اور امداد تمہارے کمزور لوگوں کی وجہ سے (یا برکت سے) ملتی ہے۔

نیز سرکاری یا نجی اداروں میں ملازمت کے کئی امیدوار اگر اہلیت وصلاحیت میں مجموعی طور پر مساوی درجہ رکھتے ہیں، پھر ان میں سے بعض کو ان کی زیادہ حاجت مندی کی بناء پر، یا کسی خاص علاقے کے مقامی ہونے کی بناء پر ترجیح دے دی جائے، تو اس میں بھی شرعا کوئی حرج نہیں، بلکہ ایسا کرنے میں بسا اوقات بہت سی مصلحتیں بھی ہوتی ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ کام کی صلاحیت اور امانت و دیانتداری میں وہ دوسرے امیدواروں سے کم نہ ہوں۔(۲)

سرکاری ملازمتوں میں ترجیح کا طریقہ کار

سرکاری ملازمتوں میں ترجیح علاقائی، جغرافیائی وصوبائیت کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اہلیت کی بنیاد پر ہوگی۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہ العالی لکھتے ہیں:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ: گرامی نامہ ملا، آپ نے سرکاری ملازمتوں اور املاک واراضی میں جغرافیائی اور علاقائی مساوات کے بارے میں جو سوال کیا ہے، اس کا جواب احقر کی رائے میں یہ ہے کہ اسلام نے کسی بھی منصب یا ملازمت کے سلسلے میں بنیادی طور پر یہ اصول پیش نظر رکھا ہے، کہ جس شخص کا تقرر مقصود ہو، اس میں اس منصب کی پوری اہلیت پائی جانی ضروری ہے اور

---

(۱) مسند امام احمد: ۱۹۸/۵

(۲) جدید معاشی نظام میں اسلامی قانون اجارہ: (ص: ۱۳۵)

جو شخص جس منصب کی زیادہ اہلیت رکھتا ہے، وہ اس منصب کا زیادہ اہل ہے، خواہ جغرافیائی اعتبار سے اس کا تعلق کسی خطے سے ہو، لہٰذا اس معاملے میں ترجیح کی بنیاد اہلیت ہے، نہ کہ جغرافیائی تعصبات، یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومتوں میں ایک خطے کے باشندوں کو بلا تکلف دوسرے خطوں میں متعین کیا جاتا رہا ہے، لہٰذا یہ بات تو شریعت میں کسی طرح جائز نہیں ہوسکتی، کہ جس شخص میں کسی منصب کی اہلیت نہ ہو، اس کو محض اس لئے کسی منصب پر فائز کر دیا جائے کہ وہ کسی خاص علاقے کا باشندہ ہے، البتہ اگر مختلف خطوں کے لوگ اہلیت کے اعتبار سے مساوی ہو، تو اس صورت میں انتظامی سہولت کی خاطر یہ اصول مقرر کرنا جائز ہے کہ ہر علاقے میں اس علاقے کے اہل افراد کو ترجیح دی جائے، کیونکہ وہ اس علاقے کے مسائل اور لوگوں کی نفسیات سے بھی زیادہ واقف ہوں گے اور اس علاقے کے لوگ اس سے مانوس بھی زیادہ ہوں گے۔
اس طرح اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ کسی علاقے کے لوگ باہر کے کسی عہدہ دار کو دل سے قبول نہیں کریں گے اور اس سے ملک وملت میں انتشار پیدا ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا، تو اس صورت میں اس بات کی بھی گنجائش ہوسکتی ہے کہ ملت کو انتشار سے بچانے کے لئے کسی ایسے شخص کا تقرر کر دیا جائے، جو فی نفسہ اہل تو ہو، لیکن دوسرے علاقے کے لوگوں میں اس سے زیادہ اہلیت رکھنے والے موجود ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا تھا کہ حکمران قریش ہی میں سے ہوں گے، اس کی حکمت علامہ ابن خلدونؒ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اہل عرب کا قریش کے سواء کسی اور پر جمع ہونا مشکل تھا۔
لیکن اس بات کی شرعاً ہرگز گنجائش نہیں کہ لوگوں کے متعصبانہ خیالات کی وجہ

سے نااہل فرد کو ذمہ دارانہ منصب حوالے کر دیئے جائیں، ایسی صورت میں لوگوں کی خواہشات کے اتباع کے بجائے ان کے خیالات کی اصلاح ضروری ہے۔(۱)

---

(۱) فتاویٰ عثمانی:۳/۵۱۶

باب (۴)

تنخواہ کے علاوہ ملازم کیلئے دیگر مراعات
اوران سے متعلقہ شرعی احکام

بہت سے ادارے اور کمپنیاں تنخواہ کے علاوہ دیگر سہولیات بھی فراہم کرتی ہیں، جیسے آمد ورفت کی سہولت، علاج ومعالجہ کی سہولت، آمد ورفت کی سہولت۔

آمد ورفت سہولت دوطرح کی ہوتی ہیں:

۱)...... عمومی سہولت: کہ گاڑی ملازمین کو ان کے گھروں سے لانے اور واپس گھر تک پہنچانے کا انتظام کرتی ہے۔

۲)...... خصوصی سہولت: کہ بڑے افسران کو کمپنی کی طرف سے گاڑی فراہم کی جاتی ہے۔

دوسری سہولت میں شرعی اعتبار سے اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کمپنی کی طرف سے گاڑی کو جن مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی اجازت ہو، صرف انہی مقاصد کے لئے اسے استعمال کیا جائے، اگر کمپنی کی طرف سے گاڑی کو ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی اجازت نہ ہو، تو پھر ملازم کے لئے اسے اپنے استعمال میں لانا جائز نہ ہوگا۔

علاج معالجے کی سہولت:

بہت سے اداروں کی طرف سے ملازمین کو علاج معالجے کی سہولت فراہم کی جاتی ہے،

عام طور پر ادارے اس مقصد کے لئے اپنے ملازمین کا میڈیکل انشورنس کراتے ہیں، پھر ضرورت پڑنے پر انشورنس کمپنی سے کلیم کیا جاتا ہے۔

چونکہ انشورنس کا موجودہ کاروبار قمار، ربا اور غرر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے، اس لئے کسی کمپنی کے لئے اپنے ملازمین کا مروجہ میڈیکل انشورنس کرانا جائز نہیں، الحمدللہ اب انشورنس کا متبادل ''تکافل'' کی صورت میں آچکا ہے، اس لئے بوقت ضرورت کسی ایسی ''تکافل'' کمپنی سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے، جس کی نگرانی مستند علماء کر رہے ہوں، اگر کسی طرح 'تکافل' سے انتظام کرنا مشکل ہو، تو پھر کمپنی کو چاہئے کہ اگر وہ یہ سہولت دینا چاہتی ہے، تو اپنے ذرائع آمدنی سے اس کا انتظام کرے، جس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱)...... ملازم کی تنخواہ میں میڈیکل سہولت کے نام سے کچھ رقم کا اضافہ کردے۔

۲)...... ملازم جب کسی طبی مرکز سے علاج کرائے، تو اس کی ابتدائی ادائیگی وہ خود کر دے، پھر ادارے (Reimburse) کرلے۔

یہ حکم کمپنی سے متعلق تھا، جہاں تک ملازم کے لئے اس سہولت کو استعمال کرنے کا تعلق ہے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ مذکورہ بالا صورتوں میں میڈیکل انشورنس کے علاوہ دیگر صورتوں سے فائدہ حاصل کرنا مطلقاً جائز ہے۔

اور میڈیکل انشورنس والی صورت میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کلیم کی رقم متعلقہ کمپنی خود وصول کرے اور اسے اپنے مرکزی پول میں ڈال کر پہلے اپنی آمدنی کا حصہ بنائے اور پھر اپنی طرف سے اتنی رقم کا چیک ملازم کے نام جاری کرے، تو پھر ملازم کے لئے یہ صورت استعمال کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کمپنی کی اپنی غالب آمدنی حلال ذرائع کی ہو، لیکن اگر کلیم براہ راست ملازم کے نام آئے، تو صرف اتنی رقم وصول کرنا جائز ہے، جتنی رقم ادارہ نے پریمیم کے طور پر انشورنس کمپنی کو ادا کی ہے، اس سے زائد لینا جائز نہیں، اگر غلطی سے لے لی، تو اس زائد رقم کو صدقہ کرنا واجب ہے۔

سرکاری ملازمین کے علاج معالجے کی سہولت کی دو صورتیں ہم نے ذکر کی ہیں، ملازم کے لئے ضروری ہے کہ کمپنی یا محکمے کی طرف سے جن افراد کے علاج معالجے کی سہولت ملازم کو دی گئی ہے، صرف انہی لوگوں کا علاج کرانا ملازم کے لئے جائز ہوگا، ملازم ان کے علاوہ باقی ایسے لوگ جن کے علاج معالجے کی سہولت کمپنی کی طرف سے کرانے کی اجازت نہ ہو، ان کو اپنا قریبی رشتہ دار ظاہر کر کے انکا علاج کروانا اور اس سہولت سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، یہ کمپنی کی طرف سے دی گئی سہولت سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے، جو کسی طرح بھی شرعا درست نہیں ہے۔

سرکاری ونجی طبی امداد کا غلط استعمال:

آج کل بہت سے سرکاری اور نجی پرائیویٹ اداروں کی طرف سے ملازمین کو طبی سہولیات مفت دی جاتی ہیں، جس کے لئے کچھ خاص شرائط ہوتے ہیں مثلا:

۱)......ملازم واقعی بیمار ہو، اگر بیمار نہ ہو، تو یہ سہولت میسر نہیں ہوتی۔

۲)......ایک خاص حد کے رشتہ داروں کو یہ سہولت ملتی ہے۔

۳)......بیماری کے ثبوت کے لئے کسی مستند ڈاکٹر کی تصدیق بھی ضروری ہوتی ہے۔

لیکن عموما مشاہدہ ہے ملازمین ان سہولیات سے غلط اور ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، مثلا بیمار نہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو بیمار ظاہر کرتے ہیں، بسا اوقات ڈاکٹر سے ساز باز کر کے غلط رپورٹ بھی تیار کرا لیتے ہیں، اور ڈاکٹر کو اس اسکیم میں شامل کر کے بہت سی ادویات وصول کر کے میڈیکل سٹور والے کے ہاتھ سستے داموں فروخت کر دیتے ہیں، یہ حرکت شرعا قانونا اور اخلاقا ہر طرح انتہائی غلط اور قبیح ہے، یہ ایک نہیں بے شمار گناہوں کا مجموعہ ہے، مثلا:

۱)......جھوٹ بولنے اور جعلسازی کرنے کا گناہ۔

۲)......ادارہ اور محکمے کو دھوکہ دینے کا گناہ۔

۳)......ڈاکٹر کو رشوت دینے کا گناہ اور ڈاکٹر کو گناہ میں ملوث کرنے کا گناہ۔

۴)......اور ادارے کا ناحق مال کھانا کا گناہ، لہٰذا ایسی ادویات سے حاصل کی گئی رقم ناجائز اور حرام ہے۔

سفری سہولیات (T.A.D.A)

کمپنی کے کام کے سلسلے میں بسا اوقات ملازمین کو مختلف شہروں یا ممالک کا سفر بھی کرنا پڑتا ہے، ایسی صورت میں کمپنی اپنے ملازمین کے سفر اور رہائش کے اخراجات برداشت کرتی ہے، اس سہولت کو Traveling allowance and daily allowance کا نام دیا گیا ہے بطور مخفف اسے T.A.D.A کہا گیا ہے۔

عام طور پر اس میں دو طرح کے اخراجات کمپنی برداشت کرتی ہے:

(۱) راستے کا کرایہ (Traveling Allownce)

(۲) ہوٹل میں قیام وطعام کا خرچ (daily allowance)

ان اخراجات کو برداشت کرنے کے دو طریقے ہوتے ہیں:

(الف) کمپنی ملازم کو براہ راست کوئی رقم نہیں دیتی، بلکہ سفر کے لئے مطلوبہ مقام کا ٹکٹ اور رہائش کے لئے مطلوبہ ہوٹل میں رہائش کا انتظام کر دیتی ہے، جس کی ادائیگی (Payment) ٹریولنگ ایجنسی اور ہوٹل کو براہ راست کی جاتی ہے، اگر ملازم کسی وجہ سے ہوٹل کے بجائے کسی اور جگہ قیام کرنا چاہے، تو پھر اسے وہ انتظام اپنے طور پر کرنا ہوتا ہے، کمپنی اس کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتی۔

(ب) بعض مرتبہ کمپنی ملازمین کے درجے (Grade) کے اعتبار سے ان Data کے لئے ایک مخصوص رقم متعین کر دیتی ہے، اس صورت میں کمپنی کی طرف سے ادائیگی کے پھر دو طریقے ہوسکتے ہیں:

۱)......سفر کے دوران تمام اخراجات ملازم خود برداشت کرے اور پھر ان اخراجات کا

ثبوت (Evidence) ٹکٹ اور invoices وغیرہ کی صورت میں جمع کرائے، جتنی رقم کا ثبوت جمع کرایا جائے، کمپنی اتنی رقم اسے دیدے، اسے (Re. imbursement) کہا جاتا ہے۔

اس صورت میں ملازم پر لازم ہے کہ وہ صرف حقیقی اخراجات کا ثبوت جمع کرائے، جعلی یا زیادہ رقم کی رسیدیں بنوا کر جتنی رقم حاصل کرے گا، وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی۔

۲)......دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کمپنی متعین رقم کا ملازم کو مکمل طور پر مالک بنادے کہ اس کا خرچ اس سے کم ہو، یا زیادہ، کمپنی پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں، یعنی خرچ زیادہ ہونے کی صورت میں کمپنی مزید رقم نہ دے اور کم ہونے کی صورت میں بقیہ رقم کی واپسی کا مطالبہ نہ کرے، ایسی صورت میں ملازم رقم بچ جانے کی صورت میں رقم کا مالک ہوگا اور اس پر یہ رقم کمپنی کو واپس کرنا لازم نہ ہوگا۔(۱)

ملازم کے لئے صرف وہی خرچہ لینا جائز ہے، جو خرچہ واقعۃً ہوا ہے، اس سے زیادہ ظاہر کر کے محکمے یا کمپنی سے زیادہ وصول کرنا جائز نہیں ہے، گناہ ہے، البتہ اگر سفر خرچ کا ان کو مالک بنادیا جائے، تو پھر بچنے کی صورت میں باقی رقم ان کے لئے حلال ہوگی، اگر ملازم ایسی جگہ سے آتا ہو، کہ اس کے آنے پر خرچ نہ آتا ہو اور محکمے یا کمپنی سے رقم وصول کرتا ہو، تو یہ بھی اس کے لئے جائز نہیں ہے۔

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

سوال: زید جس کمپنی میں ملازم ہے، اس کمپنی کی طرف سے دوسرے شہروں میں مال کی فروخت اور رقم کی وصولی کے لئے جانا پڑتا ہے، جس کا پورا خرچہ کمپنی کے ذمے ہوتا ہے، بعض شہروں میں زید کے ذاتی دوست ہیں، جن کے پاس ٹھہرنے کی وجہ سے خرچہ نہیں ہوتا، کیا زید دوسرے شہروں کے تناسب

---

(۱)تجارتی کمپنیوں کا لائحہ عمل:(ص:۹۹)

سے ان شہروں کا خرچہ بھی اپنی کمپنی سے وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟

جواب: اگر کمپنی کی طرف سے یہ طے شدہ ہے کہ ملازم کو اتنا سفرخرچ دیا جائے گا، خواہ وہ کم خرچ کرے، یا زیادہ، اور کرے یا نہ کرے، اس صورت میں تو زید اپنے دوست کے پاس ٹھہرنے کے باوجود کمپنی سے سفرخرچ وصول کرسکتا ہے، اور اگر کمپنی کی طرف سے طے شدہ نہیں، بلکہ جس قدر خرچ ملا ہو، ملازم اس کی تفصیلات و جزئیات لکھ کر کمپنی کو دیتا ہے اور کمپنی سے بس اتنی ہی رقم وصول کرلیتا ہے، جتنی اس نے دوران سفرخرچ کی تھی، تو اس صورت میں کمپنی سے اتنا ہی سفرخرچ وصول کرسکتا ہے، جتنا کہ اس کا خرچ ہوا۔(۱)

بغیر سواری کے آنے والے سرکاری ملازم کیلئے کرایہ سواری لینے کا حکم:

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

سوال: فیڈرل گورنمنٹ اپنے ملازمین کو سواری کا کرایہ دیتی ہے، اس کی حد بھی مقرر ہے کہ ساڑھے تین میل تک پچیس روپے اور ساڑھے سات میل سے دور سے آنے پر تیس روپے، ایک آدمی شہر میں رہتا ہے جہاں وہ ڈیوٹی دیتا ہے، یعنی سکول میں ملازم ہے اور سکول سے چار سو گز کے فاصلے پر قیام پذیر ہے، بس یا کسی اور ذریعہ سے سکول نہیں آتا، لیکن بل میں ہر ماہ ۳۰ روپے درج کردیتا ہے اور یا عذر کرتا ہے کہ میرا گھر بھی ۲۰۰، ۴۰۰ میل دور ہے، ماہ میں ایک مرتبہ جانا پڑتا ہے، اس طرح سے یہ کرایہ اور لاؤنس لینا جائز ہے یا نہیں۔

جواب: یہ کرایہ اور سواری اگر تنخواہ کا جزء ہوتا تب تو ہر حال میں اس کا لینا جائز

---

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۲۷۸/۸

تھا، لیکن حکومت نے تفصیل لکھی ہے کہ اتنی میل دور میں جس کی رہائش ہو، اس کو اتنا کرایہ دیا جائے گا، یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ رقم تنخواہ کا جزء نہیں، بلکہ کرایہ آمد ورفت ہے، لہٰذا اس نام سے اتنی ہی رقم وصول کرنا شرعا جائز ہے، جتنی رقم واقعتا کرایہ میں لگتی ہو، چنانچہ آپ کے لئے اپنی رہائش کا فاصلہ زیادہ لکھوا کر کرایہ سواری وصول کرنا جائز نہیں ہے۔

اور یہ تاویل بھی درست نہیں کہ اصلی گھر ۲۰۰، ۴۰۰ میل دور ہے، کیونکہ حکومت نے اصلی گھر تک پہنچانے اور وہاں سے واپس لانے کے کرایہ کی ذمہ داری نہیں لی ہے اور جب اس طرح حاصل کی ہوئی رقم ناجائز ہوئی، تو اس کو حکومت ہی کو واپس کرنا ضروری ہے، اس سے صدقہ کرنا بھی درست نہیں، الا یہ کہ حکومت کو واپس کرنے کی کوئی صورت نہ ہو، تو اس صورت میں بغیر ثواب کے نیت سے صدقہ کردی جائے۔(۱)

آفیسر کو کار الاؤنس کے نام سے ملنے والی رقم کا حکم:

بعض کمپنی اپنے ملازم آفیسر کو باوقار طریقہ سے سفر کرنے کے لئے گاڑی خریدنے کے لئے رقم دیتی ہے اور اسی طرح پیٹرول کے لئے ہر ماہ متعین رقم دیتی ہے، مگر ملازم آفیسر کار خریدنے کے بجائے بس میں سفر کرتے ہیں، اور ہر ماہ کار الاؤنس یعنی پٹرول کے نام سے کمپنی سے متعین رقم وصول کرتا ہے، تو اس کے بارے میں شرعی حکم میں کچھ تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ

۱)...... کمپنی جو رقم کار الاؤنس کے نام سے دیتی ہے، اگر وہ ماہانہ یکمشت متعین طور پر نہیں دیتی، بلکہ تمام ماہ پٹرول اور کار وغیرہ کے بل اور رسیدیں جمع کرانے کے بعد ان کے

(۱) فتاوی عثمانی: ۳/ ۳۹۰

مطابق رقم دیتی ہے، تو اس صورت میں اگر کوئی آفیسر جھوٹے بل اور رسیدیں دکھا کر وہ رقم لے لے اور خود بسوں وغیرہ میں سفر کرتا رہے، تو ایسا کرنا قطعاً حرام ہے اور اس صورت میں جھوٹ کا بھی گناہ ہے اور رقم بھی حرام ہے۔

۲)......لیکن اگر کمپنی کار الاؤنس کی رقم ماہانہ یکمشت دیتی ہے اور بل اور رسیدیں وغیرہ جمع کرانی نہیں پڑتیں اور یہ بات ملازم کی شرائط میں بھی داخل ہیں کہ جو رقم کار الاؤنس کے نام سے دی جائے، اس سے گاڑی خریدنا یا گاڑی ہوتے ہوئے اس سے پٹرول ڈلوانا ضروری اور لازمی ہے، تو اس صورت میں بھی اگر کوئی آفیسر وہ رقم لیتا رہے، لیکن خود بسوں اور نجی گاڑی میں لفٹ لے کر سفر کرتا رہے اور کمپنی کی بدنامی کا باعث بنے، تو اس کے لئے بھی یہ رقم لینا جائز نہیں۔

۳)......لیکن اگر کمپنی یہ رقم ماہانہ یکمشت تو دیتی ہے اور یہ بات ملازمت کی شرائط میں داخل نہیں ہے کہ یہ رقم ضرور کار یا پٹرول ہی کے لئے استعمال کی جائے گی، بلکہ وہ رقم ملازم کی ملکیت کر دی جاتی ہے اور اس کو اس رقم کے استعمال کے لئے ہر طرح کا اختیار دیا جائے، تو اس صورت میں اگر کوئی آفیسر اس رقم کو لیتا رہے، لیکن اس کو گاڑی کی خریداری یا پٹرول وغیرہ پر خرچ نہ کرے، بلکہ دوسرے مصارف میں خرچ کرے، یا جمع کر کے رکھے، تو اس کے لئے یہ رقم حرام تو نہ ہوگی، لیکن چونکہ کمپنی کا مقصد کہ ملازم باوقار طریقہ سے سفر کرے، وہ پورا نہیں ہو رہا ہے، اس لئے اس میں کراہت ضرور ہوگی۔

سرکاری گاڑی بغیر اجازت دوسرے کاموں میں استعمال کرنے کا حکم

سوال: بعض سرکاری ملازم کو گاڑی ویگن وغیرہ سرکاری کام کے لئے ملی ہوئی ہوتی ہے، وہ ملازم بعض مواقع پر اپنے رشتہ دار اور واقف کار سواریوں کو بھی بٹھا لیتا ہے، رشتہ داروں کا سامان رکھ کر ادھر ادھر پہنچا دیتا ہے، بغیر اجازت کے ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب: آپ نے صحیح سمجھا، بغیر اجازت اس گاڑی کو ذاتی کاموں میں خود استعمال کرنا یا کسی اور سے کروانا جائز نہیں ہے۔(۱)

ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ملازم اس گاڑی کا مالک نہیں ہے اور کمپنی یا ادارے نے وہ گاڑی کمپنی یا ادارے کے کام ہی کے استعمال کے لئے دی ہے، اپنی ذاتی کام میں یا کسی بھی ایسے فرد کے کام میں گاڑی استعمال میں لانا جس کا محکمے کے کام کے ساتھ تعلق نہ ہو، ناجائز ہے، ملکیت غیر میں تصرف کرنے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

چنانچہ درمختار میں ہے:

"لایجوز التصرف فی مال وغیرہ بلا إذنه ولا ولایته "۔(۲)

سرکاری گاڑی کا بے جا استعمال:

آپ کے مسائل اور انکا حل میں ہے:

سوال: میں ایک سرکاری ملازم ہوں، عہدہ اور تنخواہ کے لحاظ سے مجھے کار رکھنے کا حق حاصل ہے، حکومت کی طرف سے کار الاؤنس ۲۸۵ روپیہ ماہوار ملتا ہے، لیکن میں اپنی گاڑی سے دفتر نہیں آتا ہوں، دفتر آنے جانے کے لئے سرکاری گاڑی استعمال کرتا ہوں، جس کے لئے جواز یہ پیدا کرتا ہوں کہ سرکاری فائل لے جانی ہوتی ہے، اس طرح سرکاری گاڑی کے استعمال پر تقریباً ۲ ہزار روپیہ ماہوار خرچ آتا ہے۔

آپ برائے کرم احتساب کے حوالہ سے بتائیے کہ ایک مسلمان ہوتے ہوئے کیا یہ کار الاؤنس لینا میرے لئے حلال ہے؟ دوسرے سرکاری گاڑی کا اس

---

(۱)فتاوی عثمانی:۳/۴۸۰

(۲)الدرالمختار:۶/۲۰۰

طرح جواز پیدا کر کے استعمال کرنا کہاں تک جائز ہے؟ چونکہ میں اس دن سے ڈرتا ہوں جب احتساب کیا جائے گا، اس لئے خداوند کریم کی خوشنودی حاصل کرنے اور احتساب سے بچنے کے لئے مجھ کو کیا کرنا چاہئے؟

جواب: اصول یہ ہے کہ سرکاری املاک کو انہی مقاصد کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے، جن کی سرکار کی طرف سے اجازت ہے، آپ سرکاری گاڑی کے استعمال کو اس اصول پر منطبق کر لیجئے، اگر کار الاؤنس کے ساتھ آپ کو سرکاری گاڑی کے استعمال کی اجازت نہیں، تو یہ استعمال غلط اور لائق مواخذہ ہے۔(۱)

ملازم کا سرکاری بچا ہوا تیل اپنے لئے فروخت کرنا جائز نہیں ہے

بعض دفعہ حکومت کی طرف سے گاڑی چلانے کے لئے ملازم کو روزانہ کے حساب سے تیل ملتا ہے، بعض ملازمین اس تیل سے بچے ہوئے تیل کو اپنے لئے فروخت کر کے اس کی قیمت اپنے استعمال میں لاتے ہیں، شرعاً ملازم کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے ملازم کو جو تیل ملتا ہے، وہ گاڑی میں استعمال کے لئے ہوتا ہے، وہ بیچنے کے لئے نہیں دیا جاتا، تیل اندازے سے دیا جاتا ہے، جو تیل بچ جاتا ہے وہ ملازم کی ملکیت شمار نہیں ہوتی، بلکہ سرکار ہی اس کی مالک سمجھی جاتی ہے، اس لئے ملازم کے لئے تیل فروخت کرنا اور اس کو اپنے کام میں لانا جائز نہیں حرام ہے۔

خرچ سے زیادہ بل وصول کرنا؟

سوال: جب مقام سے باہر جاتے ہیں، تو یومیہ خرچہ اور سفر خرچ سرکاری ملتا ہے، اور ہوٹل کا خرچ بھی، مثلاً ایک شخص ریلوے میں اے سی کلاس میں جا سکتا

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۱۵۱/۸

ہے، مگر کسی وجہ سے فرسٹ یا سکینڈ کلاس میں جاتا ہے، اور حکومت سے پیسے اے سی کے ٹلے لیتا ہے، تو کیا یہ جائز ہے؟ اگر اضافی پیسہ فقراء میں تقسیم کر دے بلا ثواب کی نیت کے تو پھر کیسا ہے؟

ایسے ہی مثلاً دوسو روپیہ یومیہ پر ہوٹل میں رہ سکتا ہے، مگر وہ پچاس روپے والے کمرے میں رہتا ہے، لیکن حکومت سے دوسو روپے لے لیتا ہے، کیا یہ جائز ہے؟ اگر اضافی ۱۵۰ روپے فقراء میں تقسیم کردے، تو پھر کیا جائز ہے؟ جب کہ بغیر نیت ثواب کے ہو۔

جواب: اگر سرکار کی طرف سے اس کی اجازت ہے، تو پھر تو کوئی اشکال نہیں۔ اگر اجازت نہیں، تو بہتر صورت یہ ہے کہ جتنا خرچہ ہوا ہو، اتنا ہی وصول کیا جائے، اور اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہو، تو زائد خرچہ کسی تدبیر سے گورنمنٹ کے خزانے میں جمع کرادیا جائے، اور اگر یہ صورت بھی نہ ہوسکے، تو مساکین کو بغیر نیت صدقہ کے دے دیا جائے۔(۱)

رینٹ ہاؤس کا مسئلہ:

ملازمین کو رینٹ ہاؤس کی سہولت دی جاتی ہے، جس کی چند صورتیں بنتی ہیں:

۱)...... اگر ادارے کی طرف سے ہر ملازم کے لئے ایک خاص مقدار میں سکیل (گریڈ) کے حساب سے ہاؤس الاؤنس مقرر ہو، مثلاً ۱۵ گریڈ ملازم کو ۷۰۰۰ سات ہزار اور ۱۸ گریڈ افسر کو ۱۰۰۰۰ دس ہزار ماہانہ گھر کے الاؤنس کے طور پر ملتے ہوں نقد رقم کی صورت میں، چاہے وہ اپنے گھر میں رہے، یا کرایہ کے گھر میں، اور چاہے مکان کا کرایہ کم ہو یا زیادہ، تمام صورتوں میں ملازم کے لئے یہ رقم لینا شرعاً جائز ہے۔

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۳۱۵/۱۰.

۲)......اگر ادارے کی طرف سے یہ سہولت صرف ان ملازمین کے لئے ہو، جن کے پاس رہائش کے لئے اپنا ذاتی مکان نہیں ہے، تو اس صورت میں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۱)......صرف وہ ملازم اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، جس کے پاس واقعی اپنا گھر نہ ہو، اگر اپنا گھر ہونے کے باوجود ملازم نے یہ ظاہر کیا کہ میرے پاس رہائش کا گھر نہیں ہے اور ادارے نے اس کو یہ سہولت فراہم کردی، اور اپنا گھر ہونے کے باوجود ہاؤس الاؤنس کے نام سے رقم وصول کرتا ہے، تو یہ رقم ملازم کے لئے جائز نہیں ہے، یہ رقم اس کے لئے باعث گناہ اور ناجائز ہے، ملازم یہ رقم نہیں لے سکتا۔

اگر گھر اس نے واقعتاً کرایہ پر لیا ہے، تو اس صورت میں مکان کا جتنا کرایہ بنتا ہے، ملازم صرف اتنے ہی کرایہ لینے کا حقدار ہے، اس سے زیادہ کرایہ نہیں لے سکتا، مثلاً مکان کا کرایہ ۸۰۰۰ آٹھ ہزار روپے ہے اور وہ محکمہ یا ادارے سے جھوٹ بول کر ۱۲۰۰۰ بارہ ہزار روپے وصول کرے، تو آٹھ ہزار سے زائد رقم اس کے لئے حلال نہیں ہے، کیونکہ یہ ادارے کے ساتھ دھوکہ ہے اور حضور ﷺ نے دھوکہ دینے سے منع فرمایا ہے، بلکہ دھوکہ دینے والے کے بارے میں سخت وعید بیان فرمائی ہے، جیسا کہ مشکوۃ میں عبداللہ بن عمرؓ اور ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا

"من غشنا فلیس منا"۔(۱)

۳)......بعض ملازمین گھر کرایہ پر لے لیتے ہیں اور پورا مکان دوسرے شخص کو کرایہ پر دے دیتے ہیں، مثلاً گھر کرایہ پر لیا، محکمہ کی طرف سے اس کو مکان الاؤنس ۸۰۰۰ ہزار روپے ماہوار ملتا ہے، جبکہ وہی مکان دوسرے شخص کو ۱۲۰۰۰ ہزار میں کرایہ پر دیدیتا ہے، شرعاً یہ بھی جائز نہیں ہے۔

---

(۱) مشکوۃ: ۲/ ۳۰۵۔ باب من لا یضمن من الجنایات۔ رواہ مسلم

۴)...... بعض اوقات ملازم گھر کرایہ پر لے لیتا ہے، لیکن اس کا ایک پورشن کرایہ پر دے دیتا ہے، جبکہ ایک میں خود رہتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ تو اس صورت میں یہ تفصیل ہے کہ اگر محکمہ کی طرف سے مکان کا دوسرا حصہ کرایہ پر دینے کی اجازت ہو، تو ملازم کے لئے کرایہ لینا جائز ہوگا اور اگر محکمہ کی طرف سے اس بات کی اجازت نہ ہو، تو ایسا کرنا جائز نہیں ہے اور اس کا کرایہ لینا ملازم کے لئے حلال نہیں ہوگا۔

فتاویٰ بینات میں اس کی کچھ تفصیل ہے، جس کو نقل کرنا انتہائی فائدہ مند ہے:

(س نمبر ۱) گورنمنٹ کی طرف سے تعمیر کردہ مکان گورنمنٹ ملازمین کو دیئے جاتے ہیں اور ان کا مکان الاؤنس کاٹا جاتا ہے، بعض ملازمین یہ صورت اختیار کرتے ہیں:

(الف) پورا مکان کرائے پر دے دیتے ہیں۔

(ب) اپنے ساتھ کچھ کرایہ دار رکھ لیتے ہیں۔

اس بات کی ملازمین کو گورنمنٹ کی طرف سے اجازت نہیں ہے، لیکن گورنمنٹ کے علم میں ہے، ایسا کرنا کیسا ہے؟ اور اس کی کمائی کی کیا حیثیت ہے؟ حرام، حلال، جائز، ناجائز، مکروہ وغیرہ

(س نمبر ۲) گورنمنٹ کے بعض محکموں کی طرف سے ملازمین کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ کوئی پرائیویٹ مکان اپنے محکمے سے چیک کرانے کے بعد پورا کرایہ محکمہ کی طرف سے لے کر اس میں رہ سکتے ہیں، بعض ملازمین یہ صورتیں اختیار کرتے ہیں:

(الف) مکان پاس کرانے کے بعد اس میں رہتے نہیں اور پورا کرایہ اپنے محکمے سے لیتے رہتے ہیں۔

(ب) مکان کا کچھ حصہ کرایہ پر دے دیتے ہیں، یا اپنے ساتھ کرایہ دار رکھ لیتے ہیں، مالک مکان کے ساتھ جو معاہدہ ہوتا ہے، اس میں اس کی اجازت نہیں ہوتی، اس کا جواب بھی پہلے کی طرح دیں۔

(سوال نمبر۳) نمبر دو پر جو سوال کیا گیا ہے (پرائیویٹ مکان کے بارے میں) ملازم کو جو کرایہ مکان دیا جاتا ہے، اس میں مکان الاؤنس شامل ہوتا ہے اگر کوئی ملازم پرائیویٹ مکان لے کر نہ رہے، یعنی اپنے طور پر کوئی بندوبست کرے، تو اس کو تنخواہ کے ساتھ جو کرایہ مکان دیا جاتا ہے، اس پر محکمے کی طرف سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہے، کیا پرائیویٹ مکان (ہاؤس رینٹ) کرایہ مکان کی بقدر کم کرائے پر لیا جاسکتا ہے، یا مکان کے لئے جتنا کرایہ طے ہوتا ہے، اس میں سے کچھ کم پر مکان لے کر کچھ رقم ملازم بچا سکتا ہے، جیسا کہ محکمے کی طرف سے اس کی اجازت نہیں ہوتی (اکثر مطلع ہوتا ہے) اور معاہدہ پورے کرایہ کا ہوتا ہے۔

الجواب باسمہ تعالیٰ: گورنمنٹ کے ادارے دو طرح کے ہوتے ہیں، فوجی محکمہ جات، سول محکمہ جات، دونوں اداروں کا اپنے ملازمین کو گورنمنٹ کواٹرز مہیا کرنے کا طرز جدا ہے، اس لئے حکم شرعی میں بھی فرق ہوگا۔

فوجی محکمہ جات: فوجی محکمہ جات اپنے ملازمین کو جو کواٹر مہیا کرتے ہیں، وہ بطور عاریت کے ہوتے ہیں، کیونکہ متعلقہ محکمہ ان سے کسی قسم کا کرایہ یا مکان الاؤنس وصول نہیں کرتا، بلکہ انہیں رہائشی سہولیات دینے کا ذمہ دار ہوتا ہے، چنانچہ فوجی محکمہ جات کا اپنے ملازمین کے ساتھ شرعا اعارہ کا معاملہ ہوتا ہے، اس صورت میں ملازم گورنمنٹ کواٹر کسی کو کرایہ پر دینے کا شرعا مجاز ہی نہیں،

باقی رہا یہ سوال کہ کسی کو عاریت پر دینے کا مجاز ہے، یا نہیں؟ اس کی چار صورتیں ہیں:

(۱) عاریہ مطلقہ فی الوقت والانتفاع: یعنی مستعیر (مانگ کر لینے والا) شیء مستعار (مانگ کر لی ہوئی چیز) سے جس وقت چاہے، جو چاہے نفع حاصل کرنے کا مجاز ہے۔

(۲) عاریۃ مقیدۃ فی الوقت والانتفاع: یعنی مستعیر شیء مستعار سے فلاں وقت میں فلاں نفع حاصل کرنے کا پابند ہو، اس کے علاوہ انتفاع کی اجازت نہیں۔

(۳) عاریۃ مطلقہ فی الوقت مقیدۃ فی الانتفاع: یعنی مستعیر شی مستعار سے فلاں معین وقت میں جو چاہے نفع حاصل کرنے کا مجاز ہو۔

(۴) عاریۃ مطلقۃ فی الوقت مطلقۃ فی الانتفاع: یعنی مستعیر شی مستعار سے فلاں معین وقت میں جو چاہے نفع حاصل کرنے کا مجاز ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ فوجی محکمہ جات کا اعارہ کس شق میں داخل ہے؟ عام طور پر محکمہ کا اپنے ملازمین کے ساتھ اعارہ کا معاملہ شق ثانی میں داخل ہوتا ہے اور شق ثانی کا حکم شرعی یہ ہے کہ "مستعیر کو معیر کی تقیدات کا لحاظ رکھنا اور اس کی پابندی کرنا لازم ہے، تجاوز جائز نہیں، ورنہ وہ ضامن ہوگا" چنانچہ فوجی ملازم شرعاً عاریت پر بھی کوارٹر کسی کو دینے کا مجاز نہیں۔

"ليس للمستعير أن يؤاجر المستعار من غيره وإن كانت الإعارة تمليكا عندنا، كذا في الظهيريه "۔(۱)

"وليس للمستعير أن يواجر ما استعاره، فإن آجره فعطب

(۱) الفتاوی الهنديه: ٤/٣٦٤

ضمن، لأن الإعارة دون الإجارة ، والشيء لا يتضمن ما هو فوقه ، ولأنا لو صححنا لايصح إلا لازماً ، لأنه حينئذ يكون بتسليط من المعير ، وفي وقوعه لازما زيادة ضرر بالمعير لسد باب الاسترداد إلى انقضاء مدة الإجارة ، فأبطلناه ، فإن اجره ضمنه ،حين سلمه،لأنه إذا لم يتناوله العارية كان غصبا......الخ

و هذا إذا صدرت الإعارة مطلقة، وهي على أربعة أوجه:

أحدها: أن تكون مطلقة في الوقت والانتفاع فللمستعير فيه أن ينتفع به أي نوع شاء في أي وقت شاء عملا بالإطلاق۔

والثاني :أن تكون مقيدة فيهما ، فليس له أن يجاوز فيه ما سماه عملا بالتقييد ، إلا إذا كان خلافا إلى مثل ذلك ، أو خير منه ، والحنطة مثل الحنطة۔

والثالث : أن تكون مقيدة في حق الوقت ، مطلقة في حق الانتفاع۔

والرابع : عكسه وليس له أن يتعدى ما سماه ۔"(۱)

"رجل استعار من رجل شيئا ، فأعاره ،وقال له لا تدفع إلى غيرك ، فدفع ، فهلك ، ضمن فيما يتفاوت ، وفيما لا يتفاوت ، و بدون النهي يعار فيما لايتفاوت كالدار والأرض ، وفيما يتفاوت لا ، وجملته أن العارية لا تواجر ولاترهن۔"(۲)

---

(۱)الهدايه، كتاب العارية:۳/ ۲۸۰

(۲)خلاصه الفتاوى، كتاب العارية، الفصل الاول جنس آخر:۴/ ۲۹۰

"وإن قيدها بالمستعير ، بأن قال لا تدفع إلى غيرك فدفع فهلك ضمن فيما يتفاوت وفيما لا يتفاوت ......الخ "(۱)

البتہ اعارہ مطلقہ یعنی اس میں کسی قسم کی قیود وشرائط نہ ہوں، اس کا حکم یہ ہے کہ مستعیر اول اس شرط پر آگے عاریت پر دینے کا مجاز ہے کہ مستعیر ثانی اور اول کے طرز استعمال میں تفاوت نہ ہو، لیکن اگر مستعیر ثانی اس مکان میں ایسا پیشہ اختیار کرتا ہے جو مکان کی عمارت کو متاثر کرے ، مثلاً لوہار، بڑھئی وغیرہ تو مستعیر اول کو عاریت پر بھی دینے کا اختیار نہیں، الا یہ کہ مالک مکان کی طرف سے صریح اجازت ورضامندی ہو۔

"ولـه أن يعير غيره ، سواء كان شيئا يتفاوت الناس في الانتفاع به أو لا يتفاوتون ، إذا كانت الإعارة مطلقة ، لم يشترط في المستعير الانتفاع بها بنفسه ، فأما إذا شرط عليه ذلك فله أن يعير ما لا يتفاوت الناس في الانتفاع به ، دون ما يتفاوتون ، كذا في خزانة المفتيين"۔ (۲)

لہٰذا چونکہ محکمہ جات کا اپنے ملازمین کے ساتھ اعارہ مقید ہوتا ہے، چنانچہ فوجی ملازم متعلقہ محکمہ کی قیود وشرائط کا پابند ہے، ان سے تجاوز نہیں کرسکتا، اس لئے کسی دوسرے کو عاریت پر دینے کا مجاز نہیں۔

سول محکمہ: سول محکمہ جات کا اپنے ملازمین کے ساتھ شرعاً ''اجارہ'' کا معاملہ ہوتا ہے، چنانچہ ملازمین مکان الاؤنس کے نام سے کرایہ کٹواتے ہیں، اور

---

(۱) البحر الرائق کتاب العارية: ۲۸۲/۷

(۲) الهنديه: ۳٦٤/٤

بحیثیت کرایہ دار کے رہائش پذیر ہوتے ہیں، اجارہ کا معاملہ بھی مقید ہوگا قیود و شرائط کے ساتھ یا مطلق ہوگا۔ اگر یہ اجارہ مقیدہ ہو تو مستاجر کو ان تقییدات کا پابند ہونا ہوگا، چنانچہ اگر یہ شرط لگائی کہ کسی کو کرایہ پر نہیں دے سکتا، تو مستاجر کرایہ پر دینے کا مجاز نہیں، سول محکمہ جات کا اجارہ اسی شق میں داخل ہے اور گورنمنٹ کا ملازم کو کرایہ دار ٹھہرانے کی اجازت نہ دینا اس پر قرینہ ہے، جیسا کہ سوال میں مذکور ہے، چنانچہ ملازم نے کرایہ پر دیا، تو اس سے حاصل شدہ آمدنی حلال نہیں، بدوں نیتِ ثواب اس کا تصدق واجب ہے، لیکن اجارہ مطلق ہو، تو مستاجر کرایہ پر دینے کا مجاز ہے، مگر اس میں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

اول...... کرایہ دار اور ثانی کرایہ دار کے طرز استعمال میں کوئی تفاوت و فرق نہ ہو، مثلاً لوہار بڑھئی وغیرہ نہ ہو، جس کا پیشہ عمارت کو متاثر کرے۔

دوسرا...... اجارہ اسی قدر کرایہ پر واقع ہو، جس قدر پر پہلا ہوا تھا، یا اس سے کم پر ہو، تو اجرت کے حلال طیب ہونے میں بھی کوئی تردد نہیں، اگر زیادہ پر واقع ہو، تو اس کی دو صورتیں ہیں:

ایک...... یہ کہ اول کرایہ دار نے اپنی طرف سے کوئی زیادتی مکان وغیرہ میں کر دی ہے، مثلاً مکان میں فرش کر دیا، یا الماری لگا دی، یا اسی قسم کی اور کوئی چیز بڑھا دی، تو اجرت کی زیادتی بھی حلال ہے۔

دوسری صورت...... یہ کہ کچھ زیادتی نہیں کی، بلکہ بجنسہ اسی طرح مکان وغیرہ کرایہ پر دے دیا ہے جس طرح اور جس ہیئت سے خود لیا تھا، تو زیادتی اس کے لئے حلال طیب نہیں ہے۔

”ولو استاجر داراً وشرط على المستاجر أن يسكن هو بنفسه ولا يسكن معه غيره فالإجارة جائزة وللمؤاجر في هذا الشرط منفعة“۔ (۱)

”وفى الفصل استاجر دارا بكذا، ولم يسم الذى يسكنها، له أن يسكنها، ويسكنها من شآء، ويضع فيها ما يشاء، ولو كان فيها بير ماء توضاء منها ويشرب ......الخ ۔ ولا يسكن فيها الحداد و القصار، و لا يمنع من كسر الحطب فى الدار، فإن زاد وهو يوهن البناء ليس له ذلك، إلا برضاء المالك، أو يشترط فى الإجارة“۔(۲)

”المستاجر إذا أجر الدار بأكثر ما يستاجر تصدق بالفضل، إلا إذا أصلح فيها شيئا ۔ وفى المحيط: فإن لم تزد فى الدار شيئا ولا اجر معها شياء اخر من ماله يجوز عقد الإجارة عليه، ولا يطيب له، وإن خصها أو اجر ما استاجر شيئا من ماله يجوز أن يعقد عليه الإجارة ويطيب لها الزيادة إن كنس الدار ثم أجر له يطيب له“۔(۳)

”وإذا استاجر داراً وقبضها، ثم آجرها، فإنه يجوز أن آجرها بمثل ما استاجرها، أو أقل وإن آجرها بأكثر مما استاجرها، فهى جائزة أيضا، إلا أنه إن كانت الأجرة الثانية من جنس الأجرة الأولىٰ، فإن الزيادة لاتطيب له يتصدق بها، وان كانت

(۱)الفتاویٰ الهندية:۴/۴۴۴

(۲)خلاصه الفتاویٰ:۳/۱۱۷

(۳) حواله بالا

من خلاف جنسها طابت له الزيادة ، ولو زاد في الدار كما لو وتد فيها وتدا ، أو حفر فيها بئرا، أو طينا ، أو أصلح أبوابها ، أو شيئا من حوائطها طابت له الزيادة ، و أما الكنس فإنه لايكون زيادة ، وله أن يواجرها من شاء ، إلا الحداد و القصار و الطحان وما اشبه ذلك مما يضر بالبناء ويوهنه ، هكذا في السراج الوهاج"۔(۱)

اجرت کی تفصیل:(۱) گورنمنٹ کے بعض محکموں میں ملازم کو اجازت دی جاتی ہے کہ کسی پرائیویٹ مکان کا نقشہ متعلقہ محکمہ سے پاس کروائیں اور اس پاس کردہ مکان کا اپنی رہائش کے لئے مالک مکان کے ساتھ عقد اجارہ کرلیں ،تو گویا گورنمنٹ اس ملازم کو وکیل فی الاجارہ بناتی ہے، اس صورت میں اگر مالک مکان ملازم کو کچھ یا سارے کرایہ سے بری الذمہ یا ہبہ کردیتا ہے، تو یہ جائز ہے اور ملازم کو پھر بھی گورنمنٹ سے کرایہ وصول کرنے کا حق رہے گا، یہ صرف اس صورت میں ہے کہ گورنمنٹ ایک معین مکان میں ملازم کو وکیل فی الاجارہ بنائے اور یہ صورت یہاں موجود ہے، کیونکہ متعلقہ محکمہ اس مکان کا نقشہ پاس کرنے کے بعد ملازم کو ''وکالۃ فی الاجارۃ'' کی اجازت دیتا ہے اور یوں یہ مکان متعین ہوجاتا ہے۔

''وفي المحيط : لو وكل رجلا بأن يستاجر له دارا بعينها ففعل، فالوكيل يطالب بالأجرة ، والوكيل يطالب المؤكل بالأجرة ، وإن لم يطالبه الأجر ، وإن وهب الأجر الاجر من الوكيل أو أبرأه صح وللوكيل أن يرجع بالأجر على الآمر''۔(۱)

(۱)الفتاوى الهندية: ٤/٤٢٥

(۲) دوسرے بعض محکموں کا حکم ذکر کرنے سے قبل دو باتیں ذہن نشین رہیں:
(۱) ایک ہے کرایہ مکان کے مصارف کی ذمہ داری۔
(۲) دوسری ہے کرائے کی مد میں مقرر شدہ رقم کی ادائیگی۔
مذکورہ دونوں باتوں کا شرعاً حکم جدا ہے۔
چنانچہ بعض محکموں میں ملازم کو اجازت ہوتی ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق کوئی پرائیویٹ مکان پسند کر کے مالک مکان سے معاہدہ کر لے، جس قدر کرایہ مکان کے مصارف ہوں گے، متعلقہ محکمہ اس کا کفیل ہوگا، اس صورت میں ملازم حضرات خود کرایہ دار کی حیثیت سے رہائش پذیر ہوتا ہے، اگرچہ اس کے کرائے کی کفالت گورنمنٹ کرتی ہے، اس کا تفصیلی حکم سول محکمہ جات کے عنوان کے تحت گزر چکا ہے کہ اجارہ مقیدہ ہونے کی وجہ سے ملازم کسی کو کرایہ دار رکھنے کا مجاز نہیں۔
باقی رہا اس صورت میں ملازم کا زیادہ کرایہ ظاہر کر کے کم کرایہ پر مکان لینا اور بقیہ رقم اپنے مصرف میں استعمال کرنا جائز نہیں، کیونکہ گورنمنٹ اس کے کرایہ مکان کے مصارف کی ذمہ دار ہے، چنانچہ جس قدر کرایہ ہوگا اسی قدر محکمہ سے وصول کرنا جائز ہوگا، اس سے زیادہ وصول کرنا حلال نہیں۔
(۳) بعض محکموں میں ملازم کی حیثیت و منصب کے مطابق کرایہ مکان کی مد میں رقم مقرر ہوتی ہے اور محکمہ ملازم کو ایک سال کا پیشگی کرایہ مکان کرایہ کی مد میں مقرر شدہ نصاب کے مطابق دے دیتا ہے، خواہ ملازم اس سے زیادہ پر مکان لے یا کم پر، متعلقہ محکمہ اس کا ذمہ دار نہیں ہوتا، اس صورت میں ملازم کے لئے کچھ بچا لینا کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

سوال نمبر ۲ کے جزء الف کا حکم یہ ہے کہ جو ملازمین گورنمنٹ سے پرائیویٹ مکان پاس کروانے کے بعد اس میں رہائش پذیر نہیں ہوتے، بلکہ محکمہ کو دھوکہ دے کر محض کاغذی کاروائی کرتے ہیں اور محکمہ سے پورا کرایہ وصول کرتے ہیں، وہ واضح دھوکہ دہی اور کذب بیانی سے کام لے رہے ہیں، جس سے دوسرے مستحقین کی حق تلفی بھی ہوتی ہے اور متعلقہ محکمہ سے خیانت بھی، چنانچہ اس طرح دھوکہ دہی اور کذب بیانی سے گورنمنٹ کا پیسہ بٹورنا ناجائز اور حرام ہے۔

......اپنے لئے کرایہ پر مکان لیکر دوسرے کو کرایہ پر دینے کا حکم:

سوال: میں واپڈا میں ملازم ہوں اور محکمہ کی طرف سے ہمیں مکان ہائر کرانے کے لئے پیسے ملتے ہیں، لیکن اگر مکان ہائر کرائے اور اس میں خود نہ رہے، بلکہ کسی اور کو کرایہ پر دے اور پھر اس سے ملنے والی رقم سے قرض ادا کرتا رہے، تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر واپڈا کا قانون یہ ہے کہ ہر ملازم کو مکان کا کرایہ دیا جاتا ہے، چاہے وہ مکان خود استعمال کرے یا کسی اور کو دیدے، تو مذکورہ صورت میں کرایہ پر مکان لے کر کسی دوسرے کو کرایہ پر دینا جائز ہے اور اس رقم کو اپنے استعمال میں لانا بھی جائز ہے، ہاں اگر واپڈا کا قانون ایسا نہیں ہے، تو اس طرح کرایہ کی رقم حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔

(۱) خلاصة الفتاوى، كتاب الاجارة الفصل الرابع فى اجارة الدواب: ۳/ ۱۲۵

(۲) فتاوىٰ بينات: ۴/ ۲۴۸

باب (۴)

ملازم کے مختلف فنڈز اوران کے شرعی احکام

مختلف فنڈز

مختلف طرح کے اداروں اور کمپنیوں میں مختلف قسم کے فنڈز سے ملازمین کی مالی معاونت اور مدد کی جاتی ہے، جس کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ محکمہ یا ادارہ ہر ماہ ملازم کی تنخواہ سے کچھ رقم کاٹتا ہے اور پھر ایک مخصوص مدت کے بعد کچھ اضافہ کے ساتھ وہ رقم ملازم کو واپس کردی جاتی ہے، جیسے بینوولنٹ فنڈ، جی پی فنڈ، ایمپلائیز ویلفیئر فنڈ، گریجویٹی وغیرہ۔

اس طرح گروپ انشورنس کے ذریعے بھی ملازم کی مالی معاونت کی جاتی ہے، ذیل میں ہر ایک سے متعلق کچھ ضروری گفتگو کی جاتی ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ: (provident Fund)

اس فنڈ کے نام سے ہر ماہ ملازم کی تنخواہ میں سے کچھ رقم کاٹی جاتی ہے، اس کٹوتی کی دو صورتیں ہیں:

۱)......جبری کٹوتی۔

۲)......اختیاری کٹوتی۔

جبری کٹوتی کا مطلب یہ ہے کہ ملازم کی تنخواہ میں سے ہر حال کچھ رقم کاٹی جاتی ہے، ملازم کو نہ کٹوانے کا اختیار نہیں ہوتا، یعنی ملازم چاہے بھی کہ تنخواہ میں سے یہ رقم نہ کٹے، تب

بھی کاٹی جاتی ہے، اس کو جبری کٹوتی کہتے ہیں۔

اور اختیاری کٹوتی وہ ہوتی ہے کہ جس میں ملازم کو مجبور نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کو اختیار ہوتا ہے۔

دونوں صورتوں میں یہ رقم بمعہ کچھ اضافی رقم کے ملازم کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس کی زندگی میں اسے واپس مل جاتی ہے، اگر اس دوران ملازم فوت ہو جائے، تو اس کے ورثاء کو یہ رقم ملتی ہے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ملازم سے کٹوتی جبراً ہوئی ہو، تو ملازم کے لئے اصل رقم بمعہ اضافہ کے لینا جائز اور درست ہے، کیونکہ اس صورت میں ملنے والا اضافہ شرعاً سود نہیں، یعنی یہ سود کے زمرے میں نہیں آتا، بشرطیکہ وہ ادارہ یہ رقم اپنے خزانے سے دے۔

اور اگر کٹوتی اختیاری ہو، تو اس میں رباء کا شبہ پایا جاتا ہے، ایسی صورت میں زائد ملنے والی رقم سے احتیاط کرنا بہتر ہے، البتہ اصل رقم جو ملازم سے کاٹی گئی ہے اور ملازم کی محکمہ کے پاس جمع ہوئی ہے، وہ لینا بہر حال جائز ہے، اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور چونکہ ملازم اپنی زندگی میں اس اصل رقم کے لینے کا مستحق ہوتا ہے، اس لئے اگر دوران ملازمت ملازم فوت ہو جائے، تو یہ رقم ملازم کا ترکہ شمار ہوگی، جسے ملازم کے شرعی ورثاء کے درمیان ان کے شرعی حصص کے مطابق تقسیم کرنا ضروری ہوگا۔

یہ حکم اس وقت ہے جب اس رقم میں سرمایہ کاری میں ملازم کا کوئی عمل دخل نہ ہو، لیکن اگر ملازم خود کمپنی کو حرام سرمایہ کاری کی اجازت دے جو عام طور پر ایک الگ کاغذ (Doucument) کے ذریعے دی جاتی ہے، تو ایسی صورت میں کمپنی اس کی طرف سے سرمایہ اس مخصوص جگہ پر سرمایہ کاری کرنے کی وکیل ہوگی، لہٰذا ملازم کو اس ناجائز سرمایہ کاری کا گناہ بھی ہوگا اور اس کے لئے اپنی اصلی رقم سے زائد لینا بھی ناجائز ہوگا۔

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی فرماتے ہیں:

''پراویڈنٹ فنڈ اگر جبری ہو، تو اس پر جو زیادتی محکموں کی طرف سے ملتی ہے،

وہ شرعاً "سود" کی تعریف میں داخل نہیں، لہٰذا اس کا لینا جائز ہے، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ اس زیادہ رقم کو صدقہ کر دیا جائے"۔ (۱)

پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والے نفع کا حکم:

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

سوال: ایک ملازم کی تنخواہ سے ماہوار ایک خاص رقم بطور "جی پی فنڈ" کاٹ دی جاتی ہے اور جس وقت ملازم کی میعاد ملازمت ختم ہو جاتی ہے، تو ریٹائر ہونے کے بعد جتنی رقم اس ملازم کی جمع ہوئی ہے، اس کی دگنی رقم امداد کی شکل میں مل جاتی ہے، کیا اس رقم کا لینا جائز ہوگا؟

جواب: جبری پراویڈنٹ فنڈ پر جو زیادتی محکمہ دیتا ہے، وہ بحکم سود نہیں ہے، اس لئے اس کا لینا جائز ہے۔ (۲)

پراویڈنٹ فنڈ سود کیوں نہیں؟

یہ سود اس لئے نہیں کہ سود ایسا معاملہ ہوتا ہے جو دو طرفہ بنیاد پر طرفین کے درمیان طے ہو کر وجود میں آتا ہے، پراویڈنٹ فنڈ کے لئے تنخواہ میں سے جبری کٹوتی کی جاتی ہے اور وہ حصہ ملازم کو نہیں دیا جاتا، اس وجہ سے اس حصہ پر نہ تو ملازم کا قبضہ ہوا اور نہ اس کی ملکیت ہے اور اس رقم کے ساتھ محکمہ جو اضافہ کرتا ہے اپنی ملکیت ہی میں کرتا ہے اور اپنی ہی ملکیت اضافہ کرنا سود نہیں ہے، پھر جب محکمہ یہ اضافہ ملازم کو دیتا ہے، تو درحقیقت ہدیہ دیتا ہے۔

---

(۱) فتاویٰ عثمانی: ۳/۲۷۷

(۲) فتاویٰ عثمانی: ۳/۲۹۰

پروویڈنٹ فنڈ اور بینک کے سود میں فرق:

کفایت المفتی میں ہے:

(جواب ۱۰۶) پراویڈنٹ فنڈ میں نصف رقم عطیہ ہوتی ہے اور نصف ملازم کی تنخواہ میں سے وضع کی ہوئی ہوتی ہے، چونکہ وہ بھی ملازم کے قبضے میں آنے سے پہلے وضع کر لی جاتی ہے، اس لئے اس کا سود اور نصف رقم عطیہ کا سود دونوں مل کر عطیہ کا حکم لے لیتی ہے اور نصف رقم وضع شدہ سے زائد جو رقم ملتی ہے، وہ سب عطیہ ہی قرار پاتی ہے، بینک کا سود اس سے مختلف ہے، دونوں میں وجہ فرق یہ ہے کہ بینک میں اپنے قبضے سے نکال کر رقم جمع کی جاتی ہے، اس لئے اس (بینک) کا سود حقیقتاً سود ہوتا ہے۔(۱)

بینوولنٹ فنڈ:

اس فنڈ کے نام سے بھی ہر ماہ ملازم کی تنخواہ سے کچھ رقم کاٹی جاتی ہے، لیکن یہ کٹوتی جبرا ہوتی ہے، اختیاری نہیں ہوتی، یہ رقم بمعہ کچھ اضافی رقم کے ساتھ ملازم کو اس کی زندگی میں نہیں ملتی اور نہ ہی ملازم کو اپنی زندگی میں لینے کا حق ہوتا ہے، بلکہ اس کے انتقال کے بعد اس کے ورثاء میں ادارہ جس کو دینا چاہے دے دیتا ہے، شرعی ورثاء میں حقوق میراث کے مطابق تقسیم نہیں کی جاتی، البتہ ملازم کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے خاندان میں سے کسی ایک فرد کو یا کئی افراد کو جن کو وہ چاہے اس رقم کی وصولیابی کے لئے نامزد کر دے، اور ایک سے زیادہ افراد نامزد کرنے کی صورت میں ان کو دیئے جانے والے حصوں کا تعین بھی کر سکتا ہے۔

(۱) کفایت المفتی: ۸/۹۵

چونکہ اس فنڈ کی کٹوتی جبرا اور ملازم کی رضامندی کے بغیر ہوتی ہے، اس لئے ملازم کے لئے اصل رقم بمعہ اضافہ لینا جائز ہے اور ملنا والا اضافہ شرعا سود نہیں ہے، بشرطیکہ ادارہ یہ رقم اپنے خزانہ سے دے، نیز چونکہ ملازم اپنی زندگی میں اسے لینے کا مستحق نہیں ہوتا، اس لئے یہ رقم ملازم کا ترکہ شمار نہیں ہوگی، لہٰذا اس کو ملازم کے شرعی ورثاء کے درمیان ان کے شرعی حصوں کے مطابق تقسیم کرنا ضروری نہیں ہوگا، بلکہ ادارہ یا کمپنی جس کو دے گی اس کے لئے ابتداءً یہ عطیہ ہوگی اور جس کو یہ رقم دی جائے گی، وہی اس کا مکمل طور پر مالک ہوگا۔

ملازم کا پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لینا:

اگر کوئی ملازم اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لے اپنی کسی ضرورت کے لئے تو یہ شرعا قرض نہیں ہے، اس صورت میں اگر محکمہ ملازم سے سود وصول کرے، تو وہ حقیقتاً سود نہیں ہے، کیونکہ ملازم نے اپنے حق میں سے رقم قرض لی ہے، سود کے نام پر وہ جو رقم محکمے کو واپس جمع کراتا ہے، وہ اسی کے نام پر جمع ہوتی ہے اور وہ اس کو واپس مل جاتی ہے، اس لئے شرعا یہ قرض لینا بالکل جائز ہے۔

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

سوال: اگر کوئی ملازم دفتر میں نوکری کرتا ہے، تو اس کی تنخواہ سے کچھ حصہ پراویڈنٹ فنڈ کے طور پر کاٹ لیا جاتا ہے، جس کو جمع کر کے ریٹائرمنٹ یا اس سے قبل نوکری چھوڑتے ہوئے دگنا ملازم کو دیا جاتا ہے، کیا یہ ساری زیادتی شرعا سود نہیں ہے؟ لیکن جب یہ ملازم اس سے قرض لے کر قسطوں میں ادا کرتا ہے، تو اس سے سود لیا جاتا ہے، تو کیا یہ سود نہیں ہے؟ اور یہ مسئلہ مفتی صاحب کے رسالہ میں یا کہیں ہے؟

جواب: پراویڈنٹ فنڈ کی رقم سے قرض لینے پر واپسی کے وقت جو زائد رقم سود کے نام سے فنڈ میں دی جاتی ہے، شرعاً وہ سود نہیں۔ یہ مسئلہ بھی حضرت مفتی اعظم صاحب قدس سرہ کے رسالہ ''پراویڈنٹ فنڈ'' ہی میں موجود ہے۔(۱)

ایمپلائیز ویلفیر فنڈز:

بعض کمپنیوں میں ہر ملازم کی تنخواہ میں سے ایک مخصوص شرح کے تحت کچھ رقم ہر ماہ ایمپلائیز ویلفیئر فنڈ کے نام سے کٹتی ہے، منہا ہونے والی اس رقم کو کسی علیحدہ اکاونٹ یا فنڈ کے ذریعے استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ وہ غیر متعین طور پر کمپنی کے کاروبار(Business) ہی میں استعمال ہوتی رہتی ہے، پھر جب کوئی ملازم فارغ ہوتا ہے، تو کمپنی اس کو کٹوتی شدہ رقم کے اوپر ایک مخصوص تناسب سے اضافی رقم دیتی ہے، اس فنڈ کی کٹوتی لازمی ہوتی ہے اور ملازم اپنی ملازمت کے دوران اس رقم کو وصول نہیں کرسکتا، البتہ اس کو کبھی اس رقم کی ضرورت ہو، تو کمپنی کی پالیسی یہ ہے کہ کمپنی اس کو اس وقت تک کی جمع شدہ رقم کے ۷۵٪ تک قرض کی سہولت دیتی ہے اور بعد ازاں یہ قرضہ اس سے دوبارہ وصول کرکے فنڈ میں جمع کردیا جاتا ہے۔

بینوولنٹ فنڈ کی طرح اس کی کٹوتی بھی چونکہ جبراً ہوتی ہے، اس لئے اصل رقم بمعہ اضافہ لینا جائز ہے اور ملنے والا اضافہ شرعاً سود نہیں، بشرطیکہ ادارہ یہ رقم اپنے خزانہ سے دے اور اس میں حلال رقم غالب ہو، جبکہ پراویڈنٹ فنڈ کی طرح ملازم اپنی زندگی میں اسے لینے کا مستحق ہوتا ہے، اس لئے اگر دوران ملازمت ملازم فوت ہوجائے، تو یہ رقم ملازم کا ترکہ شمار ہوگی، جسے ملازم کے شرعی ورثاء کے درمیان ان کے شرعی حصوں کے مطابق تقسیم کرنا ضروری ہوگا۔

---

(۱) فتاویٰ عثمانی: ۳۰۸/۳

گروپ انشورنس:(Grop insurence)

مروجہ انشورنس رباء، قمار، اور غرر جیسی خرابیوں پر مشتمل ہے، اس لئے علماء کرام نے مروجہ انشورنس کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے، کسی بھی کمپنی کے لئے اپنے ملازمین کا انشورنس کرانا ناجائز اور حرام ہے، اس سے بچنا ضروری ہے، ضرورت کے وقت انشورنس کا متبادل ”تکافل“ پر عمل کیا جاسکتا ہے، یعنی کمپنی اپنے ملازمین کا تکافل کرالیں تو اس کی گنجائش ہے۔

یہ حکم تو کمپنی سے متعلق تھا جہاں تک ملازم کے لئے اس سہولت کو استعمال کرنے کا تعلق ہے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر کلیم کی رقم متعلقہ کمپنی خود وصول کرے اور اس سے اپنے مرکزی پول میں ڈال کر پہلے اپنی آمدنی کا حصہ بنائے اور پھر اپنی طرف سے اتنی رقم کا چیک ملازم کے نام جاری کرے، تو پھر ملازم کے لئے یہ سہولت استعمال کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کمپنی کی اپنی دیگر آمدنی حلال ذرائع کی ہو، لیکن اگر کلیم براہ راست ملازم کے نام آئے، تو صرف اتنی رقم وصول کرنا جائز ہے، جتنی رقم ادارہ نے پریمیم کے طور پر انشورنس کمپنی کو ادا کی ہے، اس سے زائد لینا جائز نہیں، اگر غلطی سے لے لی، تو اس زائد رقم کو صدقہ کرنا واجب ہے۔

مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی گروپ انشورنس کے بارے میں لکھتے ہیں:

”گروپ انشورنس“ کے قواعد وضوابط دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس اسکیم میں ہر ملازم کی تنخواہ سے جبری طور پر کٹوتی وصول کی جاتی ہے، اگرچہ محکمہ والوں کے لئے ایسا کرنا درست نہیں، لیکن جن ملازمین کی تنخواہ سے جبراً یہ رقم وصول کی گئی ہے، اگر انہیں یہ رقم واپس نہ ملی، تو یہ محکمہ والوں کی طرف سے شرعاً ’غصب‘ ہوگا، اور اگر کسی حادثے کی صورت میں کوئی بڑی رقم اصل رقم سے زائد دی گئی، تو یہ پراویڈنٹ کی زیادتی کی طرح سود شمار نہیں ہوگی، کیونکہ دین ضعیف پر زیادتی ہے، مرحوم کے وارثان کے لئے اسے وصول کرنے کی گنجائش ہے،

لیکن احتیاط اس میں ہے کہ جو رقم اصل کٹوتی سے زائد وصول ہوئی ہے، اسے صرف غریبوں پر خرچ کیا جائے، خواہ رشتہ دار ہوں، یا غیر رشتہ دار۔" (۱)

پنشن اور گریجویٹی:

جب کوئی ملازم کسی کمپنی یا ادارے سے ریٹائر ہوتا ہے، یا دوران ملازمت اس کا انتقال ہوجاتا ہے، تو بعض ادارے یا کمپنیاں اسے گریجویٹی اور پنشن کے نام سے کچھ رقم دیتی ہے، جو دراصل تنخواہ یا اجرت کا حصہ نہیں ہوتا، بلکہ محکمہ یا ادارے کی طرف سے ملازم کے لئے ایک انعام ہوتا ہے، جو کمپنی یا ادارے کی طرف سے ملازم کی خدمات کے اعتراف میں اور اس کی مالی معاونت کرنے کی غرض سے ملازم کو دیا جاتا ہے۔

پنشن اور گریجویٹی کی رقم کا تعین مدت ملازمت اور تنخواہ کے اعتبار سے ہوتا ہے، جو رقم ملازم کو دی جاتی ہے اسے دو حصوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے، آدھی رقم ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد دی جاتی ہے، اسے گریجویٹی کہتے ہیں اور بقیہ آدھی رقم وقفہ وقفہ سے مثلاً ماہانہ تاحیات ملتی ہے، اس کو پنشن کہا جاتا ہے۔

یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ پنشن جب تک وصول نہ ہوجائے، اس وقت تک ملکیت میں داخل نہیں ہوتی، لہٰذا میت کے انتقال کے بعد جتنی رقم محکمہ کی طرف سے ملے گی، وہ رقم ملازم کا ترکہ شمار نہیں ہوگی، لہٰذا بینوولنٹ فنڈ کی طرح اسے بھی ملازم کے شرعی ورثاء کے درمیان ان کے شرعی حصوں کے مطابق تقسیم کرنا ضروری نہیں ہوگا، بلکہ ادارہ یا کمپنی جس کو دے گی، اس کے لئے یہ رقم ابتداء عطیہ ہوگی اور جس کو یہ رقم دی جائے گی، وہی اس کا مکمل طور پر مالک ہوگا۔

اس کا حکم: یہ ہے کہ اگر محکمہ کی ملازمت شرعاً جائز ہو، تو اس کی طرف سے ملنے والی پنشن

---

(۱) فتاویٰ عثمانی: ۳/۳۳۷

بھی جائز ہے، اور اگر محکمے کی ملازمت ناجائز اور حرام ذرائع سے ہو، تو اس کی تنخواہ کی طرح اس کی پنشن بھی ناجائز اور حرام ہوگی۔

کفایت المفتی میں ہے:

سوال: جو قدیمی طریقہ ختم میعاد ملازمت پر پنشن کا ہے، یہ جائز ہے یا ناجائز؟

جواب (از نائب مفتی مدرسہ امینیہ) ملازمت کی میعاد ختم ہو جانے پر جو گورنمنٹ کی طرف سے بحساب نصف تنخواہ کے تاحیات ملازم کے پنشن ملتی ہے، تو یہ جائز ہے، اس کے عدم جواز کی وجہ شرعی نہیں پائی جاتی۔ فقط واللہ اعلم (اجابہ کتبہ حبیب المرسلین)

(جواب ۱۰۹) (از مفتی اعظمؒ) پنشن جو ملازم کو ملازمت سے سبکدوشی پر ملتی ہے، جائز ہے۔(۱)

ناجائز ملازمت کی پنشن:

احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: ایک شخص کو جو ناجائز ملازمت کر رہا تھا، پنشن مل رہی ہے، کیا اس پنشن سے اس کو یا کسی دوسرے کو انتفاع جائز ہے؟ بینوا و توجروا

الجواب: ایسی پنشن جائز ہے، بشرطیکہ پنشن دینے والے ادارے کے ذرائع آمدن حلال ہوں، ورنہ اصل تنخواہ کی طرح اس پنشن کا لینا بھی حرام ہوگا، جیسے بنک کی پنشن کہ تنخواہ اور پنشن دونوں سود سے دی جاتی ہیں۔(۲)

آج کل بہت سارے ملازمین اپنی پنشن ادارے کو بیچ دیتے ہیں، شرعاً حکومت یا کمپنی

---

(۱) کفایت المفتی: ۹۷/۸

(۲) احسن الفتاویٰ: ۳۱۶/۷۔ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی

پر اپنی پنشن بیچنا جائز ہے، شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، جیسا کہ آنے والے سوال اور اس کے جواب سے واضح ہے، چنانچہ آپ کے مسائل اوران کا حل میں ہے:

سوال: آج کل عام طور پر یہ رواج ہو گیا ہے کہ وہ لوگ جو پنشن پر جاتے ہیں، اپنی پنشن بیچ دیتے ہیں جو کہ عموماً حکومت ہی خرید لیتی ہے اور عمر کے لحاظ سے اس کی شرح کم یا زیادہ مقرر کر کے پنشنر کو یکمشت رقم ادا کر دیتی ہے، اس کے بعد پنشنر چاہے دوسرے دن ہی فوت ہو جائے، یا ۱۰۰ سال تک زندہ رہے، کیا یہ طریقہ شرعی طور پر ٹھیک ہے؟ کیا اس طرح پنشن بیچنے میں کوئی حرج تو نہیں؟
جواب: یہ معاملہ حکومت کے ساتھ جائز ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ جو شخص پنشن پر جا رہا ہے، حکومت کے ذمے اس کی جو رقم پنشن کی شکل میں واجب الادا ہے، وہ اس کا اس وقت تک مالک نہیں ہوتا، جب تک کہ اس رقم کو وصول نہ کر لے، اب اس پنشن کو گورنمنٹ کے پاس فروخت کرنے کا مطلب یہ ٹھہرتا ہے کہ گورنمنٹ اس سے معاہدہ کرتی ہے، کہ وہ اپنا یہ حق چھوڑ دے اور اس کے بجائے وہ اتنی رقم نقد لے لے، وہ ملازم اپنے استحقاق کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، پس یہاں درحقیقت کسی رقم کا رقم کے ساتھ تبادلہ نہیں، بلکہ تا حین حیات جو اس کا استحقاق تھا، اس کا معاوضہ وصول کرنا ہے، اس لئے شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔(۱)

فنڈ کی رقم پر انٹرسٹ (سود) ملنے کا حکم:

میونسپلٹی میں کسی بھی ملازم کے ریٹائر ہونے کے بعد پنشن نہیں ہوتی ہے، اس

() آپ کے مسائل اور ان کا حل:٦/٥٣

کی تنخواہ ہی سے فنڈ ماہواری کٹتا ہے اور بورڈ بھی اپنی طرف سے آدھا روپیہ خود بھی ملازم کے فنڈ میں جمع کرتا رہتا ہے اور ہر پانچ سال ہونے کے بعد میونسپل بورڈ بونس دیکر اسی کے فنڈ میں جمع کر دیتا ہے، یہ سب روپیہ بینک میں جمع ہوتا رہتا ہے، اس پر ہر سال بینک اپنے قاعدہ کے مطابق اس فنڈ کی رقم کا انٹرسٹ یعنی سود جمع کرتا رہتا ہے، آپ اس سلسلے میں مطلع فرمائیں کہ اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟ ایک صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ دو اماموں نے اس کو جائز قرار دیا ہے، کیا مسلم ملازم اس بینک کے سود سے اپنے اخراجات پورے کر سکتا ہے؟

الجواب: یہ جو ہر ملازم کی تنخواہ سے ہر ماہ فنڈ کٹتا ہے اور محکمہ خود جمع کرتا رہتا ہے اور پھر اپنی خوشی سے اور اپنی طرف سے اس میں بڑھاتا رہتا ہے، خواہ بونس کے نام سے ہو یا کسی اور طرح سے، اور جہاں چاہتا ہے خود اس رقم کو رکھتا ہے، اس میں ملازم کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے اور پھر اصل فنڈ جو تنخواہ سے کٹتا ہے، اس پر زیادہ کر کے دیتا ہے یہ سب محکمہ کا انعام ہے، اس پر سود کی شرعی تعریف صادق نہیں آتی، اس لئے یہ سود نہیں اور حرام نہیں ہے، ان سب رقوم کا لینا اور اپنے کام میں لانا شرعاً جائز ہے، بخلاف اس رقم کے جس کو انسان خود بینک میں جمع کرتا ہے اور زائد رقم ملتی ہے، یہ البتہ سود اور حرام ہوتا ہے، اور اس کا اپنے کام میں لانا جائز نہیں رہتا ہے اور نہ ہی اس رقم کو چھوڑ دینا ہی جائز رہتا ہے، بلکہ وہاں سے نکال کر خود غریبوں محتاجوں کو اس رقم کے وبال سے بچنے کی نیت سے بطور صدقہ دینا واجب ہوتا ہے۔ (۱)

---

(۱) نظام الفتاوی: ۲/۱۹۸ مکتبہ رحمانیہ لاہور

مرحوم کی بیوہ کو حکومت کی طرف سے جو پنشن ملتی ہے، آیا اس میں وراثت جاری ہوگی؟ میت کے تمام ورثاء کو اس پنشن میں سے حصہ ملے گا یا یہ صرف مرحوم کی بیوہ کا حق ہے؟ اگر یہ پنشن کی رقم ایسی ہو جو مرحوم کی زندگی میں اس کا لازمی حق بن چکی ہو اور ملازم موت سے پہلے قانوناً اس کے مطالبے کا حق رکھتا ہو، تو یہ پنشن کی رقم ترکہ میں حساب ہوگی اور اس میں تمام ورثاء کا حق ہوگا اور اگر وہ رقم ایسی ہو جو مرنے کے بعد بطور عطیہ حکومت کی طرف سے ملتی ہو، تو اس میں باقی ورثاء کا کوئی حق نہیں ہوگا، یہ پنشن صرف بیوہ ہی کو ملے گی اور ورثاء کا اس میں حق نہیں بنتا۔

مرحوم کی بیوہ کو حکومت کی طرف سے ملنے والی پنشن کا حکم:

عدالتی فیصلے میں ہے:

قرآن وسنت کے ارشادات اور حضرات فقہاء کرام کی عبارات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کسی فوت ہونے والے شخص کی وراثت اور ترکے میں کون سے اموال شامل ہوں گے اور کون سے نہیں؟

اس میں اصول یہ ہے کہ جو اموال ایسے ہوں جو انتقال کے وقت مرحوم کی ملکیت میں ہوں، یا کوئی ایسا مالی حق ہو جو مرحوم کی زندگی میں ہی واجب الادا ہو گیا ہو اور وہ اپنی زندگی میں کسی وقت اس کا لازمی طور پر مطالبہ کر سکتا ہو، تو یہ سارے اموال مرحوم کی میراث اور ترکے میں شامل ہوں گے۔

اور اگر کوئی م...تے وقت مرنے والے کی ملکیت میں نہیں ہے، یا دوسرے کے ذمے اس کا ایسا حق نہیں ہے جس کا وہ اپنی زندگی میں لازمی طور پر مطالبہ کر سکتا ہے، تو اس کی میراث اور ترکے میں شمار نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا سابقہ تفصیل کی روشنی میں اگر کسی کی بیوی کو حکومت کی جانب سے اس کے سرکاری ملازم

ہونے کی وجہ سے پنشن ملتی ہو، تو اس رقم کے مرحوم کے ترکے میں داخل ہونے یا نہ ہونے میں یہ تفصیل ہے کہ:

......اگر یہ پنشن مرحوم کے نام پر جمع شدہ ایسی رقم ہو جو زندگی میں مرحوم کا لازمی حق بن چکی تھی اور قانوناً وہ اپنی موت سے پہلے اس کے مطالبہ کا اختیار رکھتا تھا، تو پنشن کی ایسی رقم مرحوم کے ترکے میں شامل ہو کر تمام وارثوں میں حسب حصص میراث تقسیم ہوگی۔

......اور اگر وہ پنشن ایسی رقم ہو جو زندگی میں اس کا حق نہ بنی ہو، تو حکومت کی جانب سے عطیہ ہوگی اور جس وارث کے نام سے حکومت جاری کرے گی، اس کی ملکیت ہوگی باقی وارثوں کا اس میں کوئی حق نہ ہوگا، لہٰذا جب بیوی کے نام جاری ہو، تو صرف بیوی کی ہوگی۔(۱)

بینوولنٹ فنڈ، گریجویٹی، گروپ انشورنس اور جی پی فنڈ ترکہ میں شامل ہیں؟

عدالتی فیصلے میں ہے:

بینوولنٹ فنڈ، گروپ انشورنس اور جی پی فنڈ کے ترکہ میں شامل ہونے یا نہ ہونے کا مدار بھی اسی اصول پر ہے، جو پنشن کے بارے میں ہم نے سابقہ مسئلے میں ذکر کر دیا کہ ان میں سے جس فنڈ کا ملازم زندگی میں حقدار ہو چکا تھا اور وہ خود اس کے مطالبہ کرنے کا مستحق تھا، تو وہ فنڈ چاہے اس کے انتقال کے بعد ملے، تو وہ میراث کا حصہ ہوگا، اور اگر ایسا نہیں تو پھر میراث میں شامل نہیں ہوگا۔

---

(۱)ماخذہ عدالتی فیصلے:۲/۲۱۰

عام طور پر بینوولنٹ فنڈ، گریجویٹی اور گروپ انشورنس کی رقم مختلف ادارے اور محکمے فوت ہونے والے ملازم کے پسماندگان کو بطور امداد دیتے ہیں اور ملازم اپنی زندگی میں اس کا لازمی طور پر مطالبہ نہیں کر سکتا، لہٰذا ایسی صورت میں ادارہ اور محکمہ مرحوم کے ورثاء میں سے جس کو متعین کر کے فنڈ دے گا، وہ اسی کی ملکیت بنے گا، دوسرے ورثاء کا اس میں کوئی حق نہیں ہوگا۔

لیکن کسی ادارے کے قانون کے مطابق اگر یہ فنڈ زندگی میں ملازم وصول کر سکتا تھا اور وہ اس کے مطالبہ کا مستحق تھا تو ایسی صورت میں یہ فنڈ مرحوم ملازم کے ترکہ میں شامل ہو کر سب ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

تاہم گروپ انشورنس کے بارے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر گروپ انشورنس کی رقم ادارہ نے اپنے خزانہ میں شامل کر کے مرحوم ملازم کے پسماندگان کو دینا ہے، تو اس کا لینا جائز ہے، لیکن اگر گروپ انشورنس کی یہ رقم براہ راست کمپنی سے وصول کرنی پڑتی ہے، تو اس صورت میں اتنی رقم وصول کرنا جائز ہے جتنی رقم ادارہ نے پریمیم کے طور پر انشورنس کمپنی کو ادا کی ہے، اس سے زائد رقم لینا جائز نہیں، کیونکہ یہ سود کے زمرے میں آتی ہے، اگر غلطی سے لے لی ہے، تو زائد رقم کا صدقہ کر دینا واجب ہے۔

اور جہاں تک جی پی فنڈ کا تعلق ہے، تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر یہ فنڈ جبری ہے، تو اس پر اصل رقم کے ساتھ سود کے نام سے جو زائد رقم ملتی ہے، وہ شرعاً سود نہیں ہے، ورثاء کے لئے اس کا لینا جائز ہے، بشرطیکہ وہ رقم ادارہ اپنے خزانہ سے دے، لیکن اگر فنڈ اختیاری ہے، تو اس میں ربا کا شبہ ہے، اس لئے سود سے ملنے والی رقم سے بچنا چاہئے اور وصول کرنے سے احتراز بہتر ہے،

البتہ اصل رقم لینا درست ہے۔

بہر حال! یہ فنڈ جبری ہو یا اختیاری، چونکہ ملازم کو یہ رقم ادا کرنا قانونی طور پر ادارہ پر لازم اور ضروری ہے اور ملازم اپنی زندگی میں اس کا مطالبہ بھی کر سکتا ہے، اس لئے جی پی فنڈ کی رقم مرنے والے ملازم کے ترکے میں شامل ہو کر تمام ورثاء پر اصول میراث کے مطابق تقسیم ہوگی۔

گریجویٹی کے بارے میں یہ تفصیل ہے کہ اس کے ضوابط چونکہ مختلف اداروں میں مختلف ہوتے ہیں، لہٰذا اصل مدار اس اس بات پر ہے کہ اگر گریجویٹی کا ملازم زندگی میں حقدار ہو گیا تھا، تو وہ تنخواہ کا حصہ ہے اور ملازم کے ترکہ میں شامل ہوگا، اور اگر نہ ملازمت کی شرائط کا حصہ تھا اور نہ ہی ملازم زندگی میں اس کا حقدار تھا تو اس کا حکم بھی بنوولنٹ فنڈ وغیرہ کی طرح ہے، یعنی ادارہ جس کے نام جاری کرے گا، وہی اس کا مالک ہوگا۔(۱)

پیشگی تنخواہ وصول کر کے زیادہ واپس جمع کرانا:

مختلف ملازمین کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے محکمے کی طرف سے قرض لینے کی اجازت ہوتی ہے، مثلاً گھر بنانے کے لئے یا گاڑی، موٹر سائیکل وغیرہ خریدنے کے لئے ملازمین اپنے محکمے سے قرض ایڈوانس تنخواہ کی صورت میں لے لیتے ہیں، اور پھر وہ قسطوں میں ملازم کی تنخواہ سے وضع کرتے ہیں۔

بعض ملازمین پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لے کر اضافہ کے ساتھ واپس کرتے ہیں، بعض علماء تو اس کو سود قرار دے کر نا جائز قرار دیتے ہیں، جبکہ بعض علماء جیسے مفتی رشید احمد صاحبؒ اور مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ اس کو جائز قرار دیتے ہیں، اور اس کے جواز

(۱) عدالتی فیصلے: ۲/۲۱۰

کی وجہ یہ ہے کہ اس پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی، بلکہ بینک والے اس کی تنخواہ کم کر دیتے ہیں، لہذا یہ جائز ہونا چاہئے، یہ سود کے زمرے میں نہیں آتا۔

چنانچہ احسن الفتاوٰی میں ہے:

سوال: زید اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں ملازم ہے، اسٹیٹ بینک اپنے ملازمین کو چھتیس ماہ کی تنخواہ کے برابر پیشگی رقم اس غرض سے دیتا ہے کہ وہ اپنا مکان تعمیر کریں، یہ رقم ملازم کی تنخواہ سے پندرہ سال کے عرصہ میں وضع کر لی جاتی ہے، البتہ اس پر تین روپے فی صد وصول کئے جاتے ہیں اور ایک اگریمنٹ بھی ہوتا ہے جس کی رو سے زمین اور اس پر تعمیر شدہ مکان اسٹیٹ بنک کے پاس رہن کر دیا جاتا ہے، اور سود اور ادائیگی وغیرہ کی شرائط پر دستخط کر دیے جاتے ہیں، کیا از روئے شرع یہ جائز ہے؟

الجواب باسم ملہم الصواب: مسئلہ مذکورہ میں تین چیزیں قابل غور ہیں:

۱)......زیادۃ فی المرہون صحیح ہے، یا نہیں؟

۲)......دین رہن قسط وار وصول کرنا جائز ہے، یا نہیں؟

۳)......تین روپے فی صد بنام سود جو وصول کئے جاتے ہیں، وہ شرعا سود ہے، یا نہیں؟

تحقیق:

(۱) زیادۃ فی المرہون صحیح ہے۔

"قال العلامة الحصفكي رحمه الله تعالى: والزيادة في الرهن تصح"۔(۱)

---

(۱) رد المحتار: ۳۷۲/۵

(۲) دین رہن قسط وار وصول کرنا جائز ہے۔

"قال فی التنویر وشرحه: ولا یکلف من قضی بعض دینه أو أبرأ بعضه تسلیم بعض رهنه حتی یقبض البقیة من الدین"۔ (۱)

(۳) تین روپے فی صد بنام سود جو تنخواہ سے کاٹے جاتے ہیں، وہ شرعا سود نہیں، بلکہ تنخواہ تین روپے فی صد کم کر دی گئی ہے، کسی چیز کا نام بدلنے سے اس کی حقیقت نہیں بدلتی۔ (۲)

سوال مثل بالا:

سوال: دوران ملازمت سرکار سے کچھ رقم مکان خریدنے یا بنوانے کے لئے یا موٹر سائیکل خریدنے کے لئے ادھار لیتے ہیں، پھر اس پر سود کا لین دین ہوتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا وتوجروا

الجواب باسم ملہم الصواب: درحقیقت یہ قرض نہیں پیشگی تنخواہ ہے اور جو رقم بنام سود وصول کی جاتی ہے، اس کے مطابق تنخواہ کم کر دی جاتی ہے، لہٰذا یہ سود نہیں، اس لئے جائز ہے۔ (۳)

پراویڈنٹ فنڈ سے قرض زیادہ واپس کرنے کا حکم

فتاوی عثمانی میں ہے:

سوال: اگر کوئی ملازم دفتر میں نوکری کرتا ہے، تو اس کی تنخواہ سے کچھ حصہ پراویڈنٹ فنڈ کے طور پر کاٹ لیا جاتا ہے، جس کو جمع کر کے ریٹائرمنٹ یا اس

---

(۱) رد المحتار: ٥/٣٤٥

(۲) احسن الفتاوی: ٧/ ٣٠٤

(۳) احسن الفتاوی: ٧/٣٠٤

سے قبل نوکری چھوڑتے ہوئے دگنا ملازم کو دیا جاتا ہے، کیا یہ ساری زیادتی شرعاً سود نہیں ہے؟ لیکن جب یہ ملازم اس سے قرض لے کر قسطوں میں ادا کرتا ہے تو اس سے سود لیا جاتا ہے، تو کیا یہ سود نہیں ہے؟ اور یہ مسئلہ حضرت مفتی صاحب کے رسالے میں یا کہیں ہے؟

جواب: پراویڈنٹ فنڈ کی رقم سے قرض لینے پر واپسی کے وقت جو زائد رقم سود کے نام سے فنڈ میں دی جاتی ہے، شرعاً وہ سود نہیں۔ یہ مسئلہ حضرت مفتی اعظم قدس سرہ کے رسالہ ''پروویڈنٹ فنڈ'' ہی میں موجود ہے۔(۱)

(۱) فتاوی عثمانی: ۳/۳۰۸

باب(۵)

عورت کی ملازمت اوراس کے شرعی احکام

شریعت نے عورت کی عفت وعصمت اوراس کی فطرت کے پیش نظراس کے اخراجات کی ذمہ داری مردوں پر لازم کی ہے، چنانچہ بعض حالات میں یہ ذمہ داری اس کے باپ پر اور بعض حالات میں اس کے بھائیوں پر اور بعض حالات میں اس کے شوہر پر، جبکہ بعض حالات میں اس کی اولاد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، تاکہ عورت کو اپنی زندگی کے اخراجات پورا کرنے کے لئے گھر سے باہر نہ نکلنا پڑے، جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لِيُنفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهٖ﴾(۱)

ترجمہ: وسعت والا اپنی وسعت اور مالی استطاعت کے بقدر خرچ کرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خرچ کرنا مرد کی ذمہ داری ہے، وہ اپنے گھر کے اخراجات نان ونفقہ بود وباش تمام تر اخراجات پورے کرے، عورت کا خرچہ بھی اپنا خرچہ بھی بال بچوں کا اور مہمان کے اکرام کا خرچہ بھی مرد ہی پورا کرے گا۔

دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾(۲)

ترجمہ: بیٹے کے باپ پر ان کا رزق اوران کا لباس بھی معروف طریقے سے ہے۔

(۱)سورۃ الطلاق، آیت:۷

(۲)سورۃ البقرہ، آیت:۲۳۳

اس لئے تو اسلام نے عورت پر معاشی بوجھ نہیں رکھا، اس کے اخراجات اور نان ونفقہ کے ذمہ دار اس کے شوہر کو قرار دیا گیا ہے، عام حالات میں شریعت نے عورت کو گھر کی چار دیواری میں رہنے کا حکم دیا ہے اور یہی اس کی فطرت ہے اور اسی میں اس کی عزت اور آبرو ہے کہ وہ گھر کے اندر ہی کام کاج انجام دے، گھر سے باہر نہ نکلے۔

عورت کا گھر سے باہر نکلنا ہی خیر سے خالی ہے، عورت کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ گھر میں رہ کر اپنے خاوند کی خدمت کرے، اپنے بچوں کی پرورش کرے، کیونکہ وہی اپنے بچوں کی بہترین تربیت کرسکتی ہے اور ان کو تعلیم دے سکتی ہے، عورت بلا ضرورتِ شرعی کے گھر سے باہر نہ نکلے، خصوصاً اس زمانے میں جبکہ ہر طرف فتنوں کا سیلاب امڈا ہوا ہے اور بے حیائی و بے پردگی کا دور دورہ ہے اور مردوں اور عورتوں کا مخلوط ملنا عام ہے، عورت کا اپنے گھر سے باہر ملازمت کرنے کی صورت میں ان غیر شرعی امور سے بچنا نہایت دشوار ہے، اس لئے عام حالات میں عورت کو ملازمت کے لئے گھر سے باہر نکلنا جائز ہی نہیں ہے۔

لیکن بعض مجبوریوں کی بناء پر، یا خاوند کی تنگ دستی کی صورت میں عورت کے لئے اسلام میں یہ اجازت ہے کہ وہ معاشی دوڑ میں اپنے حدود کے اندر رہتے ہوئے شرکت کرسکتی ہے، لیکن وہ اہل مغرب کے نظریہ کے مطابق مردوں کی شانہ بشانہ کھڑی ہوکر معاشی سرگرمیوں میں اسلام کی رو سے ہرگز حصہ نہیں لے سکتی۔

سنن ابوداؤد میں باب کسب الاماء کے تحت لونڈیوں کے متعلق صحابہ کرام کا یہ قول منقول ہے کہ:

"نهانا عن كسب الآماء إلا ما عملت بيدها وقال باصابعه نحو الخبز والعزل والنفش"۔(۱)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو لونڈیوں کی کمائی سے منع فرمایا سوائے اس کمائی

---

(۱) سنن ابوداؤد: ۲/ ۱۳۰

کے جو وہ اپنا ہاتھ ہلا کر کرتی ہوں اور آپ ﷺ نے انگلیوں سے اشارہ کیا جیسے روئی پکانا، سوت کا تنا اور روئی دو ہنا وغیرہ۔

اسی طرح عبداللہ ابن مسعودؓ کی زوجہ محترمہ زینب بنت ابو معاویہ ایک دست کار خاتون تھیں، جو دستکاری کر کے اپنے شوہر اور اولاد کی کفالت کرتی تھی، سنن ابوداؤد کی ایک دوسری روایت میں ہے، جو غزوہ خیبر کے متعلق ہے، جس میں مذکور ہے کہ چند عورتیں جنگ میں شرکت کرنا چاہ رہی تھیں، جب ان سے ان کے خروج کی وجہ دریافت کی گئی، تو انہوں نے اپنا مقصد بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ ہم اون کاتیں گی، اور اس کے ذریعے اللہ کی راہ میں مدد کریں گی، حضور ﷺ کے زمانے میں عرب کی عورتیں عموماً یہ کام کرتی تھی اور اللہ کے نبی ﷺ نے ان کو کبھی بھی منع نہیں فرمایا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ شرعی حدود میں رہتے ہوئے اگر کوئی عورت کام کرنا چاہے، تو کر سکتی ہے۔

عورت کی ملازمت کی دو صورتیں:

شریعت نے بعض شرائط کے ساتھ عورت کو ملازمت کی اجازت دی ہے، عورت کی ملازمت کرنے کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت اور اس کا حکم:

پہلی صورت یہ ہے کہ ایسی عورت کو اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے ملازمت کی واقعی ضرورت ہے، مثلاً کوئی عورت ایسی ہے کہ اس کے اخراجات کی ذمہ داری برداشت کرنے والا کوئی نہیں ہے اور وہ اپنے نان ونفقہ کی غرض سے گھر سے باہر نکل کر کام کاج کرتی ہے، یا سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت کرتی ہے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ ایسی عورت گھر سے نکل کر ملازمت کر سکتی ہے، اس لئے گھر سے نکل کر ملازمت کرنا درست ہے، بشرطیکہ وہ مندرجہ ذیل آداب وشرائط کی پابندی کرے:

(۱) مکمل شرعی پردہ کے ساتھ باہر نکلے، بغیر پردے کے نہ نکلے، پورے بدن کو چھپا کر نکلے، نیز ملازمت عورتوں یا کم سن بچوں کے شعبہ میں ہو، بالغ اجنبی مردوں کے ساتھ اختلاط نہ ہو۔

(۲) راستے میں آتے جاتے ہوئے اور دوران ملازمت غیر محارم سے اختلاط نہ ہو۔

(۳) گھر پر رہتے ہوئے اس کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہو۔

(۴) اس کی ملازمت جائز اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حلال ہو، یعنی جس محکمے میں اس کی ملازمت ہے، وہ بذات خود جائز ہو۔

(۵) اگر عورت کا ولی موجود ہو، تو ملازمت ولی کی اجازت کے ساتھ ہو، بغیر ولی کی اجازت کے ملازمت پر نہ جائے، اگر عورت شادی شدہ ہو، تو شوہر کی اجازت ضروری ہے۔

دوسری صورت اور اس کا حکم:

دوسری صورت یہ ہے کہ عورت کو اس قسم کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ اس کا نان ونفقہ کا انتظام موجود ہے، اس کے باوجود باہر نکل کر ملازمت کرتی ہے صرف اپنا مال بڑھانے کی خاطر۔

جس میں عورت نان ونفقہ کے لئے محتاج نہ ہو، اس میں بھی اگرچہ مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ ملازمت کی گنجائش ہے، تاہم ایسی صورت میں احتیاط یہی ہے کہ ملازمت نہ کی جائے۔

عورت کی کمائی حلال یا حرام؟

جہاں تک عورت کی کمائی کے حلال یا حرام ہونے کا تعلق ہے، تو اس کا دارومدار اس کی ملازمت کی نوعیت پر ہے، جہاں اصل ملازمت اور کام حلال ہو، وہاں سے حاصل شدہ تنخواہ

حلال ہوگی اور جہاں اصل کام ناجائز ہو، تو اس سے حاصل ہونے والی تنخواہ بھی حرام ہوگی۔

اگر کوئی عورت مذکورہ بالا شرائط کی پابندی کا لحاظ کیے بغیر گھر سے نکلتی ہے اور ملازمت کرتی ہے، لیکن وہ جو کام کرتی ہے جو جائز ہے، تو ایسی صورت میں اگرچہ اس کو گھر سے نکلنے اور غیر شرعی امور کے ارتکاب کا گناہ ہوگا، لیکن اس حلال کام سے حاصل ہونے والی آمدنی حلال ہوگی۔

لیکن اگر وہ عورت تمام شرائط کی پابندی بھی کرتی ہے، لیکن کام ایسا کرتی ہے جو شرعاً جائز نہیں، مثلاً بنک کی یا انشورنس کمپنی کی ملازمت کرتی ہے، تو اس کی آمدنی حلال نہیں ہوگی۔

"قال في بدائع الصنائع: وقال أبو حنيفةؒ أكره أن يستاجر الرجل امرأة حرة ليستخدمها ويخلو بها وكذلك الأمة وهو قول ابي يوسف ومحمد"۔(۱)

عورت کی ملازمت شرعاً کیسی ہے؟

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

سوال: میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا شریعت میں یہ جائز ہے کہ عورتیں دفتروں میں نوکری کریں، یا مل کارخانے میں، کیا ایسا کوئی قانون قرآن میں آیا ہے، جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے صادر فرمایا ہے؟ برائے مہربانی اس کا جواب آپ تفصیل سے ارشاد فرمائیں، آپ کی عین نوازش ہوگی۔

جواب: عورت کا نان ونفقہ اس کے شوہر کے ذمہ ہے، لیکن اگر کسی عورت کے سر پر کوئی کمانے والا نہ ہو، تو مجبوری کے تحت اس کو کسب معاش کی اجازت

---

(۱) بدائع الصنائع: ۱۸۹/٤

ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس کے لئے باوقار اور باپردہ انتظام ہو، نامحرم مردوں کے ساتھ اختلاط جائز نہیں۔(۱)

آج کل کے دور میں یہ ممکن ہی نہیں کہ عورت ملازمت کرے اور ممنوعات میں سے کسی ممنوع امر کا ارتکاب نہ کرے، انتہائی مشکل ہے کہ عورت ملازمت کرے اور شرائط پر پورا اترے۔

علماء نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ بغیر ضرورت شرعی اور مجبوری کے عورت ملازمت نہ کرے، اگر کسی عورت کا کوئی بھی کمانے والا نہیں ہے، تو بھی گزر بسر کرنے کے لئے جائز تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے، اگر عورت بیوہ ہے اور کوئی کمانے والا نہیں ہے، اس کے لئے سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ مناسب جگہ نکاح ثانی کرے، جب تک یہ صورت نہ ہو یا کسی وجہ سے عورت نکاح ثانی کے لئے تیار نہ ہو، تو گھر میں ہی چھوٹے بچے بچیوں کو پڑھانا شروع کردے، یا کوئی گھریلو کام ہنر وغیرہ اختیار کرلے، اس سے اپنے اخراجات کا انتظام کرے، اگر ایسی صورت بھی نہ ہوسکے تو لڑکیوں کے اسکول میں لڑکیوں کو پڑھانے کے لئے جاسکتی ہے، یا پھر ایسی جگہ ملازمت اختیار کرے، جہاں مردوں کے ساتھ اختلاط نہ ہو، یا کسی امر ممنوع کا ارتکاب نہ ہوتا ہو۔

عورت کی ملازمت اور مشکلات:

عورت اپنی ملازمت میں مذکورہ شرائط کی رعایت بھی رکھے، تو پھر بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، عورت کی ساخت فطری طور پر کمزور ہے، مردوں کی طرح کام نہیں کرسکتی، جلد تھک جاتی ہے، ٹیڑھا پن اس کی فطرت ہے، باتوں میں وزن نہیں رکھتی، ناقص العقل ہے حمل، وضع حمل اور مدت رضاعت اس کے لئے زبردست رکاوٹیں ہیں، آج کل کے دور میں پردے کی پابندی بہت مشکل ہے، مردوں کے اختلاط سے بچنا بالکل ناممکن ہے، مرد ہر

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۶/ ۵۳، ۵۴

جگہ عورت کا محافظ ہوتا ہے، اکثر ملازم پیشہ عورت ڈیوٹی کی جگہ اکیلی نہیں جا سکتی، شوہر محرم یا کوئی نوکر اور ڈرائیور اس کو پہنچاتا ہے، دو من بینک کا چوکیدار مرد ہوتا ہے، دو من پولیس اور ان کے تھانے کا سربراہ مرد ہی ہوتا ہے، پانچ سال سے کم عمر کے بچے عورتوں کی ملازمت کے لئے مستقل رکاوٹ ہیں، موجودہ دور میں جب کوئی شادی شدہ عورت ملازمت کرتی ہے اور دن میں تقریباً آٹھ گھنٹے آفس میں گزارنے پڑتے ہیں، جس کی وجہ سے گھریلو نظام اور بچوں کی تربیت بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔

عورت کی ملازمت کے نقصانات:

عورت کی ملازمت کی وجہ سے بچوں کی تربیت بہت بری طرح متاثر ہو رہی ہے، گھریلو نظام اس کی وجہ سے تباہ ہو رہا ہے، فیملی سسٹم اس کی وجہ سے ختم ہو جاتا ہے، گورباچوف کا کہنا ہے:

''اب یہ سوچو کہ عورتیں دوبارہ اپنے گھروں کی طرف واپس کیسے آئیں گی؟ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فیملی سسٹم مکمل تباہ ہو چکا ہے، اب یورپ والے چاہتے ہیں کہ عورت کو دوبارہ گھر کی زینت بنائیں لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے، اور ہمارے سیکولر تو کہتے ہیں کہ عورت کو ملازمت کے بہانے کیسے نکالا جائے، ملازمت کی وجہ سے میاں بیوی ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں، بلکہ بسا اوقات تو کئی کئی دنوں تک ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتی، خاوند کی خدمت نوکر یا نوکرانی کرتی ہے، جبکہ بچے ایسی صورتحال میں ماں باپ کی مکمل شفقت محبت اور توجہ سے محروم رہ جاتے ہیں، خاوند جب گھر میں باہر سے تھکا ہوا داخل ہوتا ہے، تو اس کے سکون اور محبت کے لئے گھر میں کوئی موجود نہیں ہوتا، بعض ملازمت پیشہ خواتین کے اخلاق خراب بلکہ بگڑ

جاتے ہیں، جس کی وجہ سے اگر عورت غیر شادی شدہ ہو، تو رشتہ نہیں ملتا اور اگر شادی شدہ ہو تو بات طلاق تک پہنچ جاتی ہے، یورپ میں میاں بیوی کا رشتہ بے حیائی اور اختلاط مرد وزن کی وجہ سے بہت زیادہ کمزور ہوتا ہے، اسی وجہ سے طلاق کی شرح بھی زیادہ ہے، مردوں اور عورتوں کے بغیر نکاح کے تعلقات ہوتے ہیں''۔

ڈاکٹر سموئیل لکھتا ہے:

''وہ نظام جو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ عورت کارخانوں میں، دکانوں میں کام کاج کرے، اس سے خواہ کتنی ہی دولت حاصل ہو، لیکن اس کا نتیجہ گھریلو زندگی تباہ کرنے کی شکل میں نکلتا ہے، کیونکہ اس نظام کا گھر کے نظام سے ٹکراؤ ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے خاندان کے ارکان ٹوٹتے ہیں اور معاشرتی روابط پاش پاش ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کی حقیقی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ گھر کی ذمہ داری پوری کرے''۔

عورت کی ملازمت سے مردوں کی بیروزگاری:

عورت کی ملازمت نے مردوں کو بھی بے روزگار کر دیا، جن گھروں کی خواتین ملازمت کرتی ہیں، اکثر ان کے مرد گھروں میں ہی رہتے ہیں، وہ خود کام نہیں کرتے، اکثر عورتیں بلا ضرورت نوکریاں کرتی ہیں اور ایسی ایسی جگہوں پر ملازمت کرتی ہیں جہاں خالص مرد کی ضرورت ہوتی ہے، وہ جگہ عورت کے لئے عقلاً اور شرعاً بالکل نامناسب ہوتی ہے، جس کی وجہ سے مرد بے روزگار ہو جاتے ہیں، ان بے روزگار مردوں کی وجہ سے ان کی بیوی اور بچے بھی پریشان ہوتے ہیں، بے روزگار مرد بے چارہ اگر کہیں ملازمت کے لئے جائے، تو انٹرویو دیتا ہے، جہاں لڑکیاں بھی پہنچ جاتی ہیں...... اور اس طرح ترجیح عورتوں کو ہی ہوتی

ہے، مرد مایوس ہو کر واپس لوٹ آتا ہے، جو لڑکی ایک مرتبہ ملازمہ لگ جائے، اب وہ دوبارہ واپس اپنے گھر کی چار دیواری کی طرف لوٹ کر نہیں آتی۔

عورتوں کی ملازمت کا فائدہ بہت کم ہے:

حصول معاش کے نکتہ نگاہ سے عورت کی ملازمت کا فائدہ بہت کم ہے، یقیناً ایسی عورتیں جو ملازمت پر جاتی ہیں، وہ اپنے گھر کے کام کاج کے لئے نوکر رکھتی ہیں، ملازمت کے لئے جاتے ہوئے وہ ڈرائیور رکھتی ہیں، یا گاڑی کرایہ کی لگاتی ہیں، اس طرح روزانہ دفتر یا آفس جاتے ہوئے اچھے کپڑے پہنتی ہے، میک اپ کرتی ہے، بغیر میک اپ اور بغیر اچھے سوٹ اور لباس کے وہ دفتر جا ہی نہیں سکتی، کیونکہ اچھا لباس پہننا، زیورات پہننا، میک اپ کرنا یہ اس کی فطرت ہے، اگر عورت کے دفتر جانے کے خرچے کو دیکھا جائے تو میرا خیال ہے کہ وہ اتنا کماتی نہیں، جتنا وہ خرچ کرتی ہے، یا اس کی کمائی میں سے اس کے لئے ماہانہ طور پر بہت کم ہی بچتا ہے۔

ملازمت پیشہ عورتوں کے تاثرات:

اخباری اطلاعات کے مطابق ایک عورت کہتی ہے کہ ملازمت کر کے انہوں نے اپنے آپ کو محفوظ تو کر لیا، لیکن معاشرتی طور پر وہ اپنے آپ کو نامکمل سمجھتی ہے۔ دوسری عورت کہتی ہے خواتین کے لئے ملازمت وبال جان بن جاتی ہے، ایک عورت کہتی ہے جو مدت ملازمت سے قبل ہی ریٹائرمنٹ لے چکی ہے کہ جب عورت گھر سے کام کے لئے نکلتی ہے، تو ان گنت مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس سے بالآخر عورت نفسیاتی طور پر مفلوج ہو جاتی ہے۔

ایک اور عورت کہتی ہے کہ شادی کو آٹھ سال ہو گئے، میرے میاں کا تبادلہ ایک طرف ہوتا ہے اور میرا دوسری طرف، آٹھ سال میں مسلسل دس ماہ سے زیادہ اکھٹے نہیں رہے۔

اس کے علاوہ عورت کے کتنے مسائل ہیں، جو ملازمت کرنے والی خواتین کو درپیش ہیں، مثلاً عورت اگر بس سٹاپ پر کھڑی ہے، تو وہاں بھی مردان کو گھورتے ہیں، سکول تک اوباش لڑکے ان کا پیچھا کرتے ہیں، سکول سے واپسی کے وقت لڑکے گھر تک آتے ہیں، عموماً ایسی عورتیں جو گھروں سے نکلتی ہیں، تو سارے کام ادھورے چھوڑ کر نکلتی ہیں، بچوں کو روتا ہوا بلبلاتا ہوا چھوڑ کر نکلتی ہیں، یہ وہ نقصانات ہیں، جو عورتوں کی ملازمت کی وجہ سے ہیں، اس لئے تو اسلام میں معاشی ذمہ داری عورت پر نہیں ہے، بلکہ معاشی ذمہ داری مردوں کے ذمے ہیں ضرورت کے بغیر عورت کا ملازمت کرنا کوئی اچھا فیصلہ نہیں ہے۔

کیا عورت سیکرٹری بن کر ملازمت کر سکتی ہے:

آج کے دور میں مخلوط ملازمت کا سلسلہ چل نکل پڑا ہے، جو انتہائی خطرناک ہے، اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ پرائیویٹ آفس میں لیڈیز سیکرٹری رکھی جاتی ہے، عموماً مالک اور سیکرٹری تنہائی میں ملتے ہیں، جب کہ خوش گپیاں لگانا، ہنسی مذاق کرنا تو ایک عام سی بات ہے، عورت کے لئے کسی مرد کی سیکرٹری بن کر ملازمت کرنا جہاں مرد کے ساتھ تنہائی لازم آتی ہو، شرعاً جائز نہیں ہے، البتہ اگر عورت کسی عورت کی سیکرٹری بن کر ملازمت کرے، تو یہ جائز ہے، جبکہ بڑی آفت تو یہ ہے کہ مرد جو سیکرٹری رکھتے ہیں عورتوں کو تو وہ بھی جوان ہی سیکرٹری رکھی جاتی ہے۔ (الامان والحفیظ)

نرس کا مردوں کے وارڈ میں ملازمت کرنا:

خواتین کا نرسنگ کی تعلیم حاصل کرنا ضرورت کی وجہ سے جائز ہے، کیونکہ ہسپتالوں میں نرسوں کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، خاص طور پر مریض خواتین کی دیکھ بھال کے لئے خواتین وارڈ میں نرس کا ہونا ضروری ہو جاتا ہے، جب عورت کا نرس بننا جائز ہے، تو نرس کو چاہیئے کہ وہ عورتوں کے وارڈ میں کام کرے، مردوں کے وارڈ میں مستقل

ملازمت کرنا نرس کے لئے درست نہیں ہے، جیسا کہ عام رواج ہے۔

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

''معتدل اور عام حالت میں کسی عورت کے لئے اجنبی مرد کی تیمارداری جائز نہیں کہ اس سے فتنے کے اندیشے ہیں، دور دراز نہیں سمجھنا چاہئے، بلکہ ہسپتالوں میں اس طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اس لئے اس بات کی تو گنجائش ہے کہ جو وارڈ خواتین کے لئے مخصوص ہوں، ان میں خواتین نرس کا کام سرانجام دیں اور شرعی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے فرائض پورے کریں، مردوں کے وارڈ میں عورتوں کا بحیثیت نرس کام کرنا یا مرد ڈاکٹر کے ساتھ ان کی تنہائی، یا ان کے ایسے لباس یا یونیفام میں رہنا جو اسلامی حجاب کے تقاضا کو پورا نہ کرتے ہوں، جائز نہیں...... غیر معمولی حالات جیسے اچانک کسی آفت سماوی کا آجانا، جس سے بہت سے لوگ ہلاک ہو جائیں، یا جنگی حالات کا معاملہ اس سے کسی قدر مختلف ہے، ایسے موقعہ پر اگر زخمیوں کی تیمارداری کے لئے مرد فراہم نہ ہوں، تو خواتین بھی شرعی حدود کی ممکن حد تک رعایت کے ساتھ تیمارداری کرسکتی ہیں، چنانچہ امام بخاریؒ نے ربیع بنت معوذؓ سے منقول ہے کہ ہم لوگ حضور ﷺ کے ساتھ (جنگ کے موقعہ پر) پانی لاتے تھے، زخمیوں کا علاج کرتے اور مقتولوں کو منتقل کرتے تھے، بخاری کے حاشیہ میں اس کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے موقعہ پر اجنبی عورت اجنبی مرد کا علاج کرسکتی ہے ''فیہ جواز معالجة المرأة الأجنبية للرجل الأجنبي للضرورة'' لیکن جیسا کہ مذکور ہوا کہ خصوصی اور غیر معمولی حالات پر عام حالات کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔(۱)

---

(۱) کتاب الفتاوی:۶/۲۰۹

خواتین کے دینی مسائل میں ہے:

سوال: کیا نرسنگ کا پیشہ جائز ہے، اگر جائز ہے، تو کن شرائط کے ساتھ؟

جواب: عورتوں کے لئے نرسنگ کی تعلیم حاصل کرنا اور اس کا پیشہ اختیار کرنا جائز ہے، بشرطیکہ عورتوں کی تعلیم گاہیں الگ ہوں، عورتوں کو عورتیں ہی تعلیم دیں، مردوں سے کوئی اختلاط نہ ہو، نہ کہیں بے پردگی کی نوبت آئے۔(۱)

عورت کے لئے ائیر ہوسٹس کی ملازمت:

عورت کی ملازمت کے بارے میں شرعی حکم ہم بیان کر چکے ہیں، مجبوری کی صورت میں شرائط کے ساتھ جائز ہے، جس کا ذکر ہم تفصیل سے کر چکے ہیں، اگر ائیر ہوسٹس یا روڈ ہوسٹس ان شرائط کا خیال رکھ کر ملازمت کرے، تو ائیر ہوسٹس بن کر ملازمت کرنا جائز ہوگا، لیکن چونکہ ائیر ہوسٹس نہ تو پردہ کرتی ہے، نہ ہی غیر محرم کے اختلاط سے بچ سکتی ہے، بلکہ اس کا کام غیر مردوں ہی کی خدمت کرنا ہے، اس لئے اصولی طور پر ایئر ہوسٹس کی ملازمت موجودہ حالات اور موجودہ صورتحال میں جائز نہیں ہے۔

آپ کے سوالات اور ان کا حل میں ہے:

سوال نمبر: (۴۰۱) جناب مفتی صاحب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ بعد سلام مسنون یہ کہ آج کل پوری دنیا میں ایئر ہوسٹس عورتیں ہیں، ہوائی جہاز کے اصول میں سے ہے کہ ان لوگوں نے عورتوں کی خدمات کو مردوں کے مقابلہ میں ترجیح دی ہے، آپ لوگ علماء مشائخ بھی ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں، آپ لوگوں نے بھی دیکھا ہوگا، ایسے موقع پر ہوائی جہاز میں ایئر ہوسٹس عورتوں کی نوکری جائز ہے، یا نہیں؟

---

(۱) خواتین کے دینی مسائل:۱/ ٦٤

کچھ عورتیں غیر شادی شدہ پابند صوم وصلوۃ ہیں، لیکن دنیوی ترقی کے لحاظ سے اگر ان کو یہ نوکری ملے، تو کیا کرنا چاہئے، نوکری کرے یا چھوڑ دے؟ امید کہ قرآن وحدیث کی روشنی سے جواب دیں گے۔

الجواب باسمہ تعالیٰ: واضح رہے کہ کہ ہوائی جہاز کی ملازمت میں کئی طرح کے خلاف شرع امور پیش آتے ہیں، جن کا ذکر و بیان مندرجہ ذیل ہے:

(۱) ان میں اکثر عورتیں جوان اور غیر شادہ شدہ ہیں، جس کی وجہ سے انہیں نگاہ بد کا شکار ہونا پڑتا ہے، اس سے حدیث کی رو سے نگاہ کے زنا کا گناہ ہوتا ہے۔

(۲) وہ عورتیں بے پردہ ہوتی ہیں، ہوائی جہاز کے اصول میں بے پردہ ہونا شاید ضروری ہے اور حدیث کی رو سے نامحرم کی طرف دیکھنے والا اور دیکھانے والا سب گناہگار ہوتے ہیں۔

(۳) ان عورتوں کی مسافر لوگوں سے بار بار ضرورت کے تحت اور کبھی کبھار بلا ضرورت باتیں ہوتی ہیں، جس کے نتیجے میں حیاء شرم کا لحاظ نہیں ہوتا اور پردہ کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے۔

(۴) بعض کو دیکھا دیکھی گناہ کی چیزیں اچھی لگتی ہیں، دین کے ساتھ بدظنی پیدا ہوجاتی ہیں، حالانکہ دین اسلام کی حقانیت اور اس کے احکام کا لازم ہونا اور ان پر عمل کرنا قرآن وسنت کی رو سے فرض اور ضروری ہے، قرآن میں عورتوں کو حکم دیا گیا ہے "وقرن فی بیوتکن" یعنی عورتوں کو گھروں میں رہنے کا حکم ہے اور ایام جاہلیت کی طرح بے پردہ ہوکر باہر جانے سے منع کیا گیا ہے، قرآن وحدیث میں اجنبی مردوں سے میل جول اور مخالطت کو منع کیا گیا ہے، ہوائی جہاز میں نوکری سے اس کی بھی خلاف ورزی ہوتی ہے، پھر بے

پردہ رہنا ان کے اصول میں ہوگا، ورنہ نوکری نہیں ملے گی، تو یہاں پر بھی یہ ملازمت نصوص شرعیہ کے خلاف ورزی ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، نیز بعض وقت ان سے دین کے عقائد واحکام کا استخفاف لازم آتا ہے، مثلاً بے پردہ رہتے رہتے پردہ سے متنفر ہوجاتی ہیں، اور اسلام پر اشکالات پیدا ہوسکتے ہیں، اس لئے ان مواضع میں کام کرنا اور عقائد واعمال میں نقصان کرنا، یہ سب ناجائز ہیں، علاوہ ازیں ہوائی جہاز میں نوکری کرنے سے فرض نماز، فرض روزہ رکھنے میں بھی فرق پڑتا ہے، جبکہ عورتوں کے لئے اس قسم کی نوکری کوئی ضروری یا واجب وسنت میں سے نہیں ہے، لہٰذا ان وجوہات کی وجہ سے مسلمان عورتوں کی نوکری ہوائی جہاز میں ناجائز وحرام ہوگی اور ان کی تنخواہ بھی مشتمل برخبث ہونے کی وجہ سے حلال وطیب نہ ہوگی، اس واسطے مسلمان عورتوں کو ایسی نوکریاں نہیں کرنی چاہئے۔(۱)

مرد اور عورت کا ایک ساتھ کام کرنا:

اگر کوئی عورت ایسی ہو، جس کا کمانے والا کوئی نہ ہو، تو اس کو ملازمت کی اجازت ہے، وہ ملازمت کرسکتی ہے، لیکن دوران ملازمت ایک تو شرعی پردے کا لحاظ رکھے، دوسرا ایسی جگہ ملازمت کرے جہاں مردوں کے ساتھ اختلاط نہ ہو، جہاں صرف عورتیں ہی ہوں، اگر کسی دفتر میں مرد بھی ساتھ کام کرتے ہوں، تو وہاں مردوں کے ساتھ بلاضرورت بات نہ کرے، صرف ضروری بات چیت کرے، ان کے ساتھ بے تکلفی اور بے پردگی اختیار نہ کرے، تو شرعاً ایسے دفتر میں بھی ضرورت کے وقت ملازمت کرسکتی ہے، جائز ہے۔

---

(۱) آپ کے سوالات اور ان کا حل: ۱۶۸/۲۔ مفتی عبدالسلام چاٹگامی

عورت کے لئے دفتر کی نوکری:

سوال: میرے والد تین سال قبل وفات پا گئے، بہن بھائیوں میں میں بڑی ہوں، بیوہ والدہ بھی ہیں، ان سب کا خرچ میرے ذمے ہے، اس مجبوری سے گھر سے کچھ دور نوکری کرتی ہوں، گاڑی پہ روزانہ آنا جانا ہوتا ہے، باپردہ آتی جاتی ہوں، مجبوری یہ ہے کہ جس دفتر میں کام کرتی ہوں، وہاں مرد بھی ہوتے ہیں، ان سے واسطہ پڑتا ہے بامر مجبوری گفتگو بھی کرنی پڑتی ہے، چہرے کا پردہ مشکل ہے، نوکری کے بغیر چارہ نہیں کہ یہی ذریعہ معاش ہے، میرے لئے شرعی حکم کیا ہے،؟

جواب: اس قسم کے مجبور کن حالات میں آپ کے لئے دفتر کی نوکری تو جائز ہے لیکن پردہ بہر صورت فرض ہے اور اس حقیقت سے دنیا کے کسی باشعور اور عقل رکھنے والے شخص کو مجال انکار نہیں کہ عورت کے پورے جسم میں فتنہ کا مرکز اس کا چہرہ ہے، چہرہ ڈھانکے بغیر پردہ کا کوئی تصور نہیں ؛ بالخصوص آپ جس ماحول میں نوکری کر رہی ہیں، اس میں پردہ کی ضرورت و اہمیت ظاہر ہے، عیاں راچہ بیاں، اگر فرض کرلیں کہ اس ماحول میں فتنہ کا کوئی امکان نہیں، تو بھی نامحرم مرد وعورت کا ایک دوسرے کو بقصد تلذذ دیکھنا، ہم کلام ہونا اپنی جگہ مستقل گناہ ہے، جسے حدیث میں زناء سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

”فزنا العين النظر وزنا اللسان النطق وزنا الأذنين الاستماع“۔

آنکھوں کا زنا نامحرم کو دیکھنا ہے، زبان کا زنا اس سے بولنا ہے، اور کانوں کا زنا

اس کی گفتگو سننا ہے، الغرض یہ کہ چہرے سمیت پورے بدن کا پردہ آپ پر فرض ہے، باپردہ رہ کر ضرورت کی گفتگو نامحرم سے کرسکتی ہیں، ہاں باپردہ رہنے کے لئے برقع پہننے رکھنا ضروری نہیں، بڑی چادر سے بدن چھپانے سے بھی پردہ کا مقصد پورا ہو جاتا ہے، اور گھونگھٹ کر کے کام بھی کیا جاسکتا ہے۔(۱)

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

سوال: عورتوں کا بینکوں، آفسوں میں مردوں کے ساتھ کام کرنا کیسا ہے؟

جواب: عورتوں کا بے پردہ غیر مردوں کے ساتھ دفاتر میں کام کرنا مغربی تہذیب کا شاخسانہ ہے، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

سوال: اگر مذہب اسلام عورتوں کو اس قسم کی اجازت نہیں دیتا، تو کیا اسلامی مملکت کی حیثیت سے ہمارا فرض نہیں کہ عورتوں کی ملازمت کو ممنوع قرار دیا جائے، کم از کم ان کے لئے پردہ یا علیحدگی لازمی قرار دی جائے۔

جواب: بلاشبہ فرض ہے اور جب کبھی "صحیح اسلامی مملکت" قائم ہوگی، انشاءاللہ عورت کی یہ تذلیل نہ ہوگی۔

نیوز چینل کی ملازمت

نیوز چینل کی ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کی ڈیوٹی میں تصویر کشی، فلم سازی، اور کسی بھی قسم کی بے حیائی فحاشی وغیرہ امور میں شرکت اور ان کا حصہ نہ بننا پڑتا ہو، تو ایسی ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے، لیکن اگر گناہ کے کسی بھی کام میں تعاون لازم آتا ہو، تو پھر یہ ملازمت جائز نہیں ہے۔

(۱) خواتین کے دینی مسائل: ۱/ ۷۷

عورت کا بناؤ سنگھار کے ساتھ ملازمت پر جانا:

سوال: ایک مسلمان خاتون کے لئے کاجل لگا کر بھوؤں کے بال صاف کر کے تعلیم گاہ جانا، یا دفتر میں حصول معاش کے لئے جانا کیسا ہے؟

جواب: جیسا کہ ہم نے اوپر کے سوال کے جواب کے بارے میں عرض کیا تھا کہ ایک مسلمان خاتون کے لئے کسب معاش کے لئے نکلنا جائز نہیں، البتہ جس ضرورت کے موقع پر شریعت نے مسلمان خاتون کے لئے گھر سے باہر نکلنے کو جائز قرار دیا ہے، اس موقع پر بھی اس خاتون پر یہ لازم ہے کہ وہ زیب وزینت کے بغیر حجاب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے گھر سے نکلے۔(۱)

شوہر اور محرم کے بغیر عورت کا بیرون ملک ملازمت کرنا:

موجودہ زمانے میں بیشمار شادی شدہ اور غیر شادی شدہ خواتین، خصوصا نوجوان لڑکیاں بغیر محرم کے بیرون ممالک اور بیرون شہروں میں ملازمت کے لئے جاتی ہیں، کچھ تو نوکری کے سلسلے میں اور کچھ خواتین پڑھائی کے سلسلے میں، شریعت میں عورت کو بغیر محرم کے شرعی سفر کرنے سے منع کیا گیا ہے، یعنی اڑتالیس میل یا اس سے زیادہ کا سفر کرنا شرعا بغیر محرم کے جائز نہیں ہے، جب سفر ہی جائز نہیں، تو دوسرے شہروں میں قیام کرنا اور وہاں ملازمت کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ خصوصا اس فتنہ کے دور میں جہاں ہر طرف بے حیائی اور بے پردگی کا ماحول میسر ہے، اللہ کے نبی ﷺ نے عورت کے لئے اکیلے سفر پر جانے سے منع فرمایا ہے، حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو عورت اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو، اس کے لئے باپ یا بھائی یا شوہر یا بیٹا یا کسی محرم کے بغیر تین دنوں

---

(۱) فقہی مقالات: ۱/۲۵۹

یا اس سے زیادہ کا سفر جائز نہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں تو ایک دن ایک رات بغیر محرم کے سفر کرنے سے بھی منع فرمایا گیا ہے، تین دن اور تین رات کے سفر سے اتنا طویل سفر مراد ہے، جو حضور ﷺ کے زمانے میں تین دن میں طے کیا جاتا ہے اور وہ اڑتالیس میل کی مسافت ہے، یہاں تک کہ حج جیسی اہم عبادت کے لئے بھی محرم کے بغیر سفر کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، اس لئے اس طرح خواتین کا ملازمت کے سلسلے میں دور دراز علاقہ میں قیام جائز نہیں ہے۔

عورت کا اسکول میں پڑھانا:

عورت اگر باپردہ ہو کر بچیوں کے اسکول میں پڑھانے جائے، تو بچیوں کے اسکول میں پڑھا سکتی ہے، جائز ہے، اگر سکول بچوں کا ہو، تو اگر بچے کمسن ہوں، مثلاً ۹ یا دس سال کے بچے ہیں، تو ان کو پڑھانا شرعاً جائز ہے، اگر لڑکے بڑے ہوں، یعنی بالغ ہوں، جیسے میٹرک کے لڑکوں کو پڑھانا یا کالج میں پڑھانا تو اس کی اجازت شرعاً نہیں ہے، بڑے لڑکوں کو عورت نہیں پڑھا سکتی، ان کو پڑھانا جائز نہیں ہے، لڑکوں کو مرد استاذ ہی پڑھائے، لڑکیوں کا لڑکوں کا پڑھانا اگرچہ پردے میں ہو، بہت ہی زیادہ خطرناک ہے۔

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

سوال: ایک ایسی عورت جو کہ اپنے تمام فرائض سے سبکدوش تقریباً ہو چکی ہے اور اس کے بچے اسکول میں پڑھتے ہیں، اور گھر میں فالتو (فارغ) ہوتی ہے، تو کیا وہ عورت اپنے گھر کے عین سامنے اسکول میں پڑھانے جا سکتی ہے، جب کہ علم کا حاصل کرنا ہر کسی پر فرض ہے، اور اس طریقے سے اس عورت کا وقت بھی اچھے کام میں صرف ہوتا ہے۔

جواب: اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو معاش سے فارغ کر رکھا ہے، تو فرصت کو

غنیمت سمجھ کر اپنی آخرت کی تیاری میں لگے، ذکر و اذکار، تسبیحات، تلاوت اور نماز میں وقت گزارے، معاشی طور پر تنگدست ہو، تو ملازمت باپردہ کی جاسکتی ہے، جس علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، وہ یہ نہیں ہے جو اسکولوں میں پڑھایا جاتا ہے۔(۱)

لیڈی پولیس بننا:

جس طرح مردوں مین مجرم ہوتے ہیں، اسی طرح عورتوں میں بھی مجرم ہوتی ہیں، اس لئے عورت کا لیڈی پولیس میں بھرتی ہونا شرعاً جائز ہے، لیکن اس کے لئے وہی شرائط ہیں، جو عورت کے ملازمت کے بارے میں گذری ہیں، نیز لیڈی پولیس کا مرد پولیس کے ساتھ اختلاط نہ ہو، عورت ٹریننگ عورتوں سے سیکھے، رہائش کے کمرے وغیرہ مکمل الگ ہوں اور عورتوں کا صرف عورتوں کے ساتھ واسطہ ہو، مردوں کے ساتھ واسطہ نہ ہو، اگر ان شرائط کا خیال نہ رکھا جائے، جیسا کہ ہمارے ہاں موجودہ نظام میں ہے، تو اس میں لیڈی پولیس بھرتی ہونا جائز نہیں ہے۔

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۸/۹۱

باب......(۶)

دینی امور کی ملازمت کے شرعی احکام

دینی کاموں پر اجرت:

موجودہ زمانے میں ایک اہم مسئلہ دینی کاموں پر اجرت لینے کا ہے، دینی کاموں سے وہ خدمات مراد ہیں، جو مسلمانوں ہی سے متعلق ہیں، جو بحیثیت مسلمان انجام دی جاتی ہیں اور دراصل اس کے نفع ونقصان اور اس پر اجر وثواب اور اس سے غفلت وبے اعتنائی پر عذاب وعقاب کا تعلق بھی اخرت کے ساتھ ہے۔

ایمان کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ان امور پر اجرت اور ان کی کوئی قیمت وصول نہ کی جائے، طاعات سے قرآن مجید اور علوم دینیہ کی تعلیم، امامت، اذان وغیرہ دینی امور مراد ہیں، کیا ان امور کے انجام دینے پر اجرت وتنخواہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

اگر خادمین دین پر اس تعاون کا دروازہ بند کر دیا جائے اور ان کے لئے تنخواہ کو ممنوع قرار دیا جائے، تو فطری بات ہے کہ یہ لوگ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے اور کسب معاش کی طلب میں طلب مال کی ریس میں شامل ہو جائیں گے، جس نے آج ہر چھوٹے اور بڑے کو دیوانہ کیا ہوا ہے، تو اس کا نقصان یہ ہوگا کہ دینی علوم کے حصول اور تعلیم وتعلم کا سلسلہ بند ہو جائے گا، مساجد میں اوقات نماز کی پابندی انتہائی مشکل ہو جائے گی، لائق اور اہل ائمہ کا ملنا ناپید ہو جائے گا، ان کی فراہمی مشکل ہو کر رہ جائے گی، دینی علوم کو پڑھانے پر اجرت کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں مختلف روایات ملتی ہیں۔

بعض روایات سے جواز اور بعض سے عدم جواز ثابت ہوتا ہے، روایات کی بنیاد پر فقہاء کرام کا بھی اس مسئلے میں اختلاف چلا آرہا ہے۔

آئمہ ثلاثہ کا مذہب:

اس بارے میں امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک تعلیم قرآن پر اجرت وتنخواہ لی جاسکتی ہے، نماز پڑھانے کی اجرت، اذان دینے کی اجرت بھی لی جاسکتی ہے، یعنی ان امور پر اجرت لینا جائز ہے، امام شافعیؒ کا استدلال ابوسعید خدریؓ کے واقعہ سے ہے، جس کو امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں ذکر کیا ہے، جس میں ہے کہ قبیلے کے سردار کو دم کیا اور اس کے بدلے میں ایک ریوڑ بکریوں کا ان کو ملا۔

امام ابوحنیفہؒ کا مذہب:

جب کہ امام ابوحنیفہؒ کے ہاں طاعات پر اجرت لینا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس قسم کا اجارہ صحیح ہوگا، چنانچہ امامت، موذنی، اور تعلیم قرآن کی اجرت جائز نہیں ہے، مثلاً کسی شخص نے کسی سے اجرت پر یہ معاملہ طے کیا کہ وہ ایک ماہ اس کو قرآن مجید کی تعلیم دے اور بطور اجرت پچاس روپے لے لے، تو اول تو یہ معاملہ ہی صحیح نہ ہوگا، یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ایک ماہ اس کے پاس جاکر اس کو پڑھائے، دوسرا اگر اس نے ایک ماہ جاکر اس کو پڑھا بھی دیا، تو اس کی کوئی اجرت پڑھنے والے پر واجب نہ ہوگی۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل:

امام صاحبؒ کا استدلال حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت سے ہے، جو سنن ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ وغیرہ میں ہے کہ انہوں نے اصحاب صفہ میں سے بعض لوگوں کو کچھ تعلیم دی، بعد میں ان میں سے کسی نے ان کو کمان دیدی، حضور اقدس ﷺ سے جب ذکر

کیا گیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اس کمان کے بدلے اللہ تمہیں دوزخ کی ایک کمان عطاء کرے، تو لے لو۔ (۱)

اس کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس لیئے جائز قرار نہیں دیا۔

فائدہ: امام ابوحنیفہؒ سے درس وتدریس اور تعلیم قرآن پر جو اجرت لینا ممنوع نقل کیا گیا ہے، اس ممانعت کی کئی وجوہ ہوسکتی ہیں:

۱)...... آپ نے کمال ورع وتقویٰ کی وجہ سے امور دینیہ پر اجرت لینے کو منع فرمایا۔

۲)...... مالدار لوگوں کے لئے مکروہ کہا۔

۳)...... جو لوگ دینی کاموں پر اجرت لینے کو مقصود بالذات سمجھیں، ان کیلئے مکروہ وممنوع ہے۔

۴)...... چونکہ خیر القرون میں مفلس خدام دین کو بیت المال سے باقاعدہ تنخواہیں اور وظیفے ملتے تھے، اس لئے ان کو الگ اجرت لینا مکروہ ہے۔

لیکن یہاں یہ بات قابل لحاظ رہے کہ سلف صالحین اور امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں علماء اور اربابِ افتاء کو اپنی ضروریات کی تکمیل اور زندگی گزارنے کے لئے بیت المال کی جانب سے وظائف وجاگیریں مقرر تھیں، جس سے آسانی کے ساتھ ان کی ضروریات پوری ہو جاتی تھیں اور اللہ سے نہ ڈرنے والے بادشاہوں نے جب علماء سے استغناء برتنا شروع کیا، تو وظائف کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ ختم ہوا، اور علماء وفقہاء اور محدثین کے لئے بظاہر اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لئے کوئی سبب اور سہارا باقی نہ رہا۔

تو ان حالات میں یہ بات ناگزیر ہوگئی کہ بڑی مصلحتوں کے تحفظ کے لئے دینی خدمات یا طاعات پر اجرت لینے کی اجازت دی جائے، ایسے حالات کو دیکھ کر بعد کے فقہاء کرام نے دینی خدمات پر اجرت لینے کے جواز کا فتویٰ دیا، چنانچہ فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ کا مشہور قول ہے کہ میں تین چیزوں کو ناجائز سمجھتا تھا اور اسی کا فتویٰ دیتا تھا جن میں سے ایک قول تعلیم

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب البیوع باب فی کسب المعلم، حدیث: ۲۹٦٤

قرآن پر اجرت کا مسئلہ بھی تھا، مگر پھر میں نے تعلیم قرآن کے ضائع ہونے کے اندیشہ سے اس کی اجازت دے دی، لیکن اس وقت تک یہ اجازت صرف تعلیم قرآن کی حد تک تھی، جیسا کہ صاحب کنز الدقائق جو ساتویں صدی کے ہیں اور صاحب ہدایہ جو چھٹی صدی کے ہیں، کہ ان کی آراء سے معلوم ہوتا ہے۔

پھر مختصر وقایہ کے مصنف نے (جن کی وفات ۶۷۳ھ میں ہے) تعلیم فقہ پر بھی اجرت کو جائز قرار دیا، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ امامت واذان اور ہر قسم کی دینی تعلیم کے لئے اجرت لینا درست اور جائز قرار پایا، علامہ شامیؒ کے رسائل جو رسائل ابن عابدین کے نام سے معروف ہے، میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ ائمہ ثلاثہ ابوحنیفہؒ ابویوسفؒ ومحمدؒ کی تمام منقول روایتیں اس پر متفق ہیں کہ طاعات پر اجرت لینا باطل ہے، لیکن ان حضرات کے بعد جو اہل تخریج وترجیح گزرے ہیں، انہوں نے تعلیم قرآن پر اجرت کے جائز ہونے کا فتویٰ ضرورتاً دے دیا، اس لئے کہ اس سے پہلے معلمین کو بیت المال سے عطیات ملتے تھے، جو کہ ختم ہو گئے، پس اگر اجرت کے دینے کو ناجائز کہا جائے، تو قرآن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے، جس میں دین کا ضیاع ہے، اس لئے کہ معلمین بھی تو کھانے کمانے کے محتاج ہیں، پھر ان کے بعد والے حضرات نے اذان وامامت پر بھی اجرت لینے کے جواز کا فتویٰ دیا، اس لئے کہ یہ دونوں بھی شعائر میں سے ہیں، ضرورۃ ان دونوں کے بارے میں بھی اجرت لینے کو جائز قرار دیا۔

البحر الرائق میں ہے:

"أما المختار للفتویٰ فی زماننا فیجوز أخذ الأجرة للإمام و المؤذن والمعلم والمفتي"۔(۱)

جن بعض آیات واحادیث سے تعلیم قرآن، اذان، امامت اور درس وتدریس پر اجرت

---

(۱) البحر الرائق: ۱/ ۲۵۴

کے عدم جواز پر استدلال کیا جاتا ہے، وہ درج ذیل وجوہ کی بناء پر ممانعت میں صریح ومتعین المعنیٰ نہیں ہیں:

۱)...... اگر ممانعت میں صریح ہوتیں، تو حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور حضرات ائمہ ثلاثہ، جمہور علماء کرام اور متاخرین فقہاء احناف رحمہم اللہ ان کے خلاف جواز کا فتویٰ کبھی صادر نہ فرماتے۔

۲)...... یہ ممانعت اس کے لئے ہے جس کا مقصد ان امور دینیہ سے دنیا کمانا ہو اور ان کو کسب معاش کا پیشہ بنایا ہو، جس کا مقصد تعلیم وتدریس سے دین کی اشاعت وتبلیغ ہو، اس کے لئے ممانعت نہیں۔

اسی کے مطابق حضرت حکیم الامت قدس سرہ فرماتے ہیں:

”بعض لوگ ان امور دینیہ پر تنخواہ لے کر دین کو دنیا بنا رہے ہیں اور بعض تنخواہ لے کر دنیا کو دین بنا رہے ہیں، اگر درس وتدریس اور تعلیم قرآن سے مقصود مال حاصل کرنا ہے، تو اس نے دین کو حقیر دنیا کمانے کا ذریعہ بنا کر اس کو دنیا بنا دیا، اور جو ان امور پر تنخواہ اس لئے لے رہا ہے کہ تاکہ دلجمعی کے ساتھ باحسن وجوہ یہ کام سرانجام دے سکے، تو اس نے دنیا کو دین بنا دیا، کیونکہ یہ تنخواہ اس لئے لے رہا ہے، تاکہ دین کی خدمت کرسکوں، ورنہ دنیا کمانے میں لگ گیا، تو دین کی خدمت چھوٹ جائے گی“۔

۳)...... یہ تعلیم وتدریس کا معاوضہ نہیں، بلکہ حبس اوقات کا معاوضہ ہے، جو جائز ہے۔

۴)...... ان احادیث میں سے اکثر ضعیف ہیں، اگر کچھ روایات صحیح بھی ہوں، تو وہ مؤول یا منسوخ ہیں۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

”دین کی اشاعت حسب استطاعت فرض ہے، اول اول جب بیت المال صحیح

قائم تھا اور وہاں سے خدمت دین کرنے والوں کے لئے وظائف مقرر تھے، تو یہ حضرات دل نہاد ہو کر اپنے اوقات کو خدمت دین میں مشغول رکھتے تھے، جو وظیفہ ملتا تھا اس سے حقوق واجبہ ادا کرتے تھے، کسی دوسرے ذریعہ معاش کی ان کو فکر نہیں تھی، حضرت عمرؓ نے بھی بیت المال سے وظائف مقرر کئے تھے، جیسا کہ نصب الرایہ میں ہے۔

پھر جب بیت المال کا حال خراب ہوگیا، مستحقین کو وہاں سے وظیفہ ملنا بند ہوگیا تو اس وقت کے مجتہد فقہاء نے استیجار علی تعلیم القرآن والفقہ والامامہ والتاذین کی اجازت دے دی، تاکہ اسلام کے شعائر محفوظ رہ سکیں اور دین ضائع نہ ہو، اس لئے خدمت دین کرنے والے حضرات اگر حقوق واجبہ کی ادائیگی کے لئے کوئی ذریعہ معاش اختیار کریں، تو اپنے اوقات کو تعلیم وتدریس میں صرف نہیں کر سکیں گے، جس سے اشاعت کی خدمت نہیں ہو سکے گی اور دین ضائع ہو جائے گا، اگر کوئی اور ذریعہ اختیار نہ کریں، تو حقوق واجبہ کے ادا کرنے کی کوئی صورت نہیں، لہٰذا دونوں پہلوؤں کی رعایت کرتے ہوئے اس کی اجازت دی گئی۔(۱)

احسن الفتاویٰ میں ہے:

’’امامت، اذان، کتب دینیہ وقرآن کریم کی تعلیم اور دوسری ہر قسم کی خدمات دینیہ پر تنخواہ لینا جائز ہے، حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے دور میں ان حضرات کو وظیفے اور تنخواہیں دیں اور خلفائے راشدین کا عمل ہمارے لئے حجت ہے‘‘۔(۲)

---

(۱)فتاویٰ محمودیہ:۲۵/۱۷

(۲)احسن الفتاویٰ:۲۷۹/۷

چنانچہ نصب الرایہ میں امام زیلعیؒ نے عمرؓ کا عمل نقل کیا ہے :

"وقد روی عن عمر بن الخطاب رضی الله عنه أنه كان يرزق المعلمين ، ثم أسند عن إبراهيم بن سعد عن أبيه أن عمر بن الخطاب رضى الله عنه كتب إلى بعض عماله أن أعط الناس على تعليم القرآن ـ انتهى كلامه"۔(۱)

ہم یہاں فقہاء کرام کی وہ عبارتیں نقل کرتے ہیں، جو اس بارے میں صریح ہیں کہ طاعات پر اجرت لینا جائز ہے۔

ردالمحتار میں ہے:

"وبعض مشايخنا رحمهم الله استحسنوا الاستئجار على تعليم القرآن اليوم ، لظهور التوانی فی الأمور الدينيه ، ففي الامتناع تضييع حفظ القرآن ، وعليه الفتوىٰ"(۲)

اور ہمارے بعض مشائخؒ نے آج کل تعلیم قرآن پر اجرت لینے کو بہتر قرار دیا ہے، کیونکہ امور دین میں لوگوں میں سستی پیدا ہوگئی ہے، تو ممانعت کی صورت میں اندیشہ ہے کہ حفظ قرآن ضائع ہوجائے گا اور اسی پر اب فتویٰ ہے ۔

اسی طرح فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"ومشائخ بلخ جوزوا الاستئجار على تعليم القرآن إذا ضرب لذلك مدة وافتوا بوجوب المسمى كذا في المحيط ، وكذا جواز الاستيجار على تعليم الفقه ونحوه المختار للفتوىٰ فی زماننا قول هؤلاء كذا فى الفتاوىٰ العتابيه "۔(۳)

---

(۱) نصب الرايه:٤/ ١٣٧

(۲) رد المحتار:٩/ ٩٤ كتاب الاجارة ،فی عدم جواز الاستجار على التلاوة

(۳) الفتاوىٰ الهنديه كتاب الاجارة الباب الخامس:٤/ ٤٤٨ ـط ماجديه

اور مشائخ بلخ نے تعلیم قرآن پر اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے، جب کہ اس کی مدت معین ہو اور معین شدہ اجرت کے واجب التسلیم ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ محیط میں بھی اسی طرح ہے اور اسی طرح تعلیم فقہ اور اس کے امثال (جیسے اذان وامامت) پر اجرت لینے کا جواز بھی ہے اور ہمارے زمانے میں فتویٰ کے لئے انہی لوگوں کا قول مختار ہے۔

فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

"الاستئجار على الطاعات لتعليم القرآن والفقه والوعظ لايجوز أى لايجب وأهل المدينة طيب الله ساكنها جوزوه، وبه أخذ الإمام الشافعي، قال في المحيط وفتوىٰ مشائخ بلخ على الجواز۔

قال الإمام الفضلي: والمتاخرون على جوازه، وكان الإمام الكرماني يفتي "بدرنا رسيده معلم را خوشنود بكنيد" وفتوىٰ علمائنا على أن الإجارة إن صحت يجب المسمىٰ وإن لم تصح يجب أجر المثل"۔(۱)

طاعات پر عقد اجارہ مثلاً تعلیم قرآن وفقہ اور تدریس ووعظ پر اجرت لینا جائز نہیں، یعنی اجرت واجب نہیں ہوتی، اور اہل مدینہ (طیب اللہ ساکنہا) طاعات پر اجرت لینے کو جائز کہتے ہیں اور امام شافعیؒ اسی کے قائل ہیں، محیط میں فرمایا کہ مشائخ بلخ کا فتویٰ جواز کا ہے۔

امام فضلی نے فرمایا کہ متاخرین حنفیہ جواز کے قائل ہیں اور امام کرمانی فتویٰ دیتے تھے کہ دروازے تک پہنچنے سے پہلے معلم کو خوش کر دو، اور ہمارے علماء کا

(۱) فتاویٰ بزازیہ: ۳۷/۲۔ کتاب الاجارۃ۔ علی ہامش الهندیه

فتویٰ ہے کہ اگر عقد اجارہ صحیح طور پر کیا گیا تو اجرت معینہ واجب ہوگی ورنہ اجر مثل لازم ہوگا۔

فقہ حنفی کی تمام متداول کتب چاہے وہ متون ہوں، یا شروح ہوں، یا فتاویٰ ہوں، ان میں یہ بات تصریح کے ساتھ مذکورہ ہے کہ طاعات پر اجرت لینا جائز ہے۔

کفایت المفتی میں ہے:

''متاخرین حنفیہ نے یہ دیکھ کر کہ بیت المال کے عطیات موقوف ہوگئے اور ذرائع معیشت میں دشواریاں پیدا ہوگئیں اور امور دین میں سستی اور بے پرواہی ظاہر ہوگئی، پس ایسی حالت میں عدم جوازِ اجرت کا حکم دینے سے دین اور شعائر مذہب کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا، اس لئے انہوں نے اس مسئلہ میں امام شافعیؒ اور اہل مدینہ کا قول اختیار کرلیا''۔(۱)

غیر حاضری کے دنوں کی تنخواہ:

امام اور مدرس کی کتنی چھٹیاں معاف سمجھی جائیں گی، اگر وہ چھٹیاں کریں، تو عرف میں جتنی غیر حاضریاں معاف سمجھی جاتی ہیں، ان ایام میں غیر حاضری کرنے کے باوجود پوری تنخواہ کا مستحق ہوگا، مثلاً مدرس یا امام کو ماہانہ چار چھٹیاں کرنے کی اجازت ہے، تو اتنی چھٹیاں کرنے کی صورت میں وہ پوری تنخواہ کا مستحق ہوگا، زیادہ غیر حاضریاں کرنے کی صورت میں مدرسے والے، یا انتظامیہ والے تنخواہ کاٹ سکتے ہیں۔

مدرس کا بیماری کے ایام کی تنخواہ لینا:

مدرس یا امام اگر کسی بیماری کی وجہ سے چھٹی کرلیں، یا مدرس درس کے لئے نہ جاسکے، تو

(۱) کفایت المفتی: ۷/ ۳۳۰ ۔دار الاشاعت

ان کے لئے ایام علالت کی تنخواہ لینا درست ہے، چنانچہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے:

''اس صورت میں زید مستحق تنخواہ ایام رخصت و بیماری مذکورہ کا ہے اور زید کو تنخواہ ایام مذکورہ کی لینا درست ہے''۔(۱)

دراصل تنخواہ دار مدرس کی چھٹیوں کا دار ومدار عرف پر ہے اور عام عرف یہی ہے کہ مدرس، امام وغیرہ کو بیماری کے دنوں کی تنخواہ دیتے ہیں، لہٰذا امام مسجد یا مدرس کے لئے بیماری کے ایام کی تنخواہ لینا بالکل جائز ہے اور کمیٹی والے یا مدرسہ کے انتظامیہ والے اس کو تنخواہ دے سکتے ہیں؛ البتہ اگر امام یا مدرس کے تقرر کے وقت یہ بات طے کی ہو کہ رخصت کے ایام کی تنخواہ نہیں دی جائے گی، تو ایسی صورت میں چھٹی کرنے کی وجہ سے وہ تنخواہ کا مستحق نہ ہوگا۔

مسئلہ: متولی مسجد یا کسی مدرسہ کے مہتمم نے کسی مدرس کو کسی دوسری جگہ سے امامت یا تدریس کے لئے بلایا، تو آنے کا خرچہ متولی اور مہتمم کے ذمے ہوگا، مثلاً ایک متولی نے راولپنڈی کی مسجد میں امامت کے لئے لاہور سے کسی امام صاحب کو بلایا، تو لاہور سے راولپنڈی کا کرایہ بھی متولی کے ذمے لازم ہوگا۔(۲)

ایام مرض کی تنخواہ

احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: ایک مدرس مدرسہ میں پڑھانے کا ارادہ رکھتا ہے، اس مدرسہ کا دستور ہے کہ ۱۰ شوال سے تعلیم شروع کی جاتی ہے، وہ مدرس ۱۶ شوال کو آکر بات کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں دو دن کے بعد آکر سبق شروع کراؤں گا، مگر وہ ایک ہفتہ کے بعد آتا ہے، آنے کے بعد پھر طبیعت ناساز ہو جاتی ہے، بالآخر ۲۹ شوال کو

(۱) فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲۷۸/۱۵ـ دار الاشاعت

(۲) هكذا فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند

اسباق شروع کراتا ہے، اس صورت میں وہ ماہ شوال کے مشاہرہ کا مستحق ہوگا یا نہیں؟ بینوا وتوجروا

الجواب باسم ملہم الصواب: جن دو دنوں کی رخصت لے کر گیا تھا، ان کی اجرت کا مستحق ہے، باقی کا نہیں، حاضری کے بعد ایام مرض کے مشاہرہ کا فیصلہ ان کے شرائط عقد کے مطابق ہوگا، اور اگر بوقت عقد ایام مرض کے مشاہرے کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی گئی تھی، تو مدارس کے عرف پر عمل ہوگا، عام مدارس کا عرف یہ ہے کہ ایام مرض کی اجرت دی جاتی ہے"۔(۱)

تعطیلات اور رخصتوں کی تنخواہیں:

جدید فقہی مسائل میں ہے:

"یہاں ایک مسئلہ پیدا ہوتا ہے مدرسین اور خادمین دین کو جن کو ہفتہ میں ایک دن تعطیل کا ہوتا ہے، یا سال میں بعض طویل تعطیلات دی جاتی ہے، ان کی تنخواہیں دی جائیں گی یا نہیں؟

تو اس مسئلہ میں یہ اصول ذہن میں رکھنا چاہئے کہ مدرسہ کی انتظامیہ کی حیثیت عوام کی طرف سے وکیل اور نمائندہ کی ہوتی ہے اور مدرسین بالواسطہ عوام کے اجیر ہوتے ہیں اس طرح چندہ دینے والے عام لوگ مدرسین کے لئے جتنے دنوں کی رخصت باتنخواہ اور عام تعطیل کو گوارہ کریں، اتنے دنوں اساتذہ کے لئے اس کا حق حاصل ہے، یہی حال بیماری کی رخصت کا بھی ہے، اب ظاہر ہے کہ چندہ دینے والے سے اس کی تحقیق اور اس پر رائے لینا دشوار ہی نہیں،

(۱) احسن الفتاوی: ۲۸٤/۷

تقریباً محال ہے، ان حالات میں دراصل عرف وعادت کا اعتبار کیا جاتا ہے
اور عرف یہ ہے کہ مدرسہ کی بڑی تعطیلات مشہور ہیں اور باتنخواہ اتفاق اور مرض
کی وجہ سے مرض کا ضابطہ بھی عام ہے، اس کے باوجود عام مسلمان مدرسوں کا
تعاون کرتے ہیں، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں یہ رخصتیں اور تعطیلات
گوارہ ہیں، لہٰذا ان کا تنخواہ لینا اور دینا جائز ہوگا، چنانچہ علامہ ابن نجیم مصریؒ
نے ''العادۃ محکمہ'' اصول کے تحت اسے جائز رکھا ہے اور یہی رائے علامہ شامیؒ
کی بھی ہے اور فقیہ ابولیثؒ کی بھی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں، کہ جہاں منگل اور
جمعہ کو عیدین میں تعطیل رہا کرتی ہوں، ان دنوں کی تنخواہ لینا حلال ہے، ایسے
ہی اگر خلاف عادت کسی دن درس قلم بند کرنے کے لئے فرصت دے دی، تو
بھی تنخواہ لے سکتا ہے، سوائے اس کا اس کے وقف کرنے والا صرف انہی ایام
کو تنخواہ دینے کی قید لگا دے جس میں درس ہوا کرے، فقیہ ابولیث نے کہا کہ
اگر استاذ طلبہ نے اسی دن کی اجرت لے جس میں درس نہ ہوا ہو، تو امید ہے
کہ وہ جائز ہوگا۔(۱)

اس لئے مدرس اگر چہ شعبان اور رمضان المبارک میں فارغ ہوتے ہیں اور درس و
تدریس کا سلسلہ موقوف ہوتا ہے، عموماً مدرسین گھروں کو چلے جاتے ہیں، تب بھی وہ شعبان
اور رمضان کی تنخواہ کے مستحق ہیں، ان کو شعبان اور رمضان کی تنخواہ ملے گی، چونکہ مدرسین
اجیر خاص ہوتے ہیں، جن کا عقد اجارہ عمل کے بجائے وقت پر ہے، جس کی مدت عرف
مدارس دینیہ میں ایک سال ہے، اگر کسی مدرس کے لئے یہ شرط بھی لگائی جائے کہ اس کو
رمضان کی تنخواہ نہیں ملے گی، تو یہ شرط فاسد ہے، تنخواہ اس کو بہرحال ملے گی، شرط فاسد کا

---

(۱) جدید فقهي مسائل :(ص: ٢٤٥)

اعتبار نہ ہوگا۔ اسی طرح جس مدرس کا تقرر شوال ۱۰ یا ۱۵ کو ہوا، تو اس کو بھی پورے شوال کی تنخواہ ملے گی۔

ایک مدرس سال کے شروع سے مدرس تھا، سالانہ چھٹیوں میں اس کو معطل کیا گیا، تو وہ رمضان کی تنخواہ کا مستحق ہوگا، اسے رمضان کی تنخواہ ملے گی۔

مدرسین کے مشاہرہ کی مختلف صورتوں کا حکم:

احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: مدرسین کی تنخواہوں کے بارے میں مندرجہ ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے:

(۱) ایک مدرس کا تقرر شوال سے ہوا، چونکہ مدرسہ (۱۱) شوال کو کھلتا ہے، اس لئے اس مدرس نے (۱۱) تاریخ کو کام شروع کیا، تو اسے تنخواہ پورے شوال کی ملے گی، یا گیارہ شوال کے بعد کی ایام کی؟

(۲) ایک مدرس ابتداء سال سے مدرس تھا، سالانہ تعطیلات کے موقع پر مدرسہ کی طرف سے آئندہ سال کے لئے اسے برطرف کر دیا گیا، تو وہ رمضان کی تنخواہ کا مستحق ہوگا یا نہیں؟

(۳) سوال نمبر ۲ میں اگر آئندہ سال کی برطرفی کی اطلاع مدرس کو وسط رمضان میں دی گئی، تو کیا حکم ہے؟

(۴) اس مدرس کا کیا حکم ہے جس کا تقرر درمیان سال میں ہوا، پھر تعطیلات کے موقع پر یا وسط رمضان میں اسے برطرف کر دیا گیا، تو رمضان کی تنخواہ کا مستحق ہے یا نہیں؟

(۵) ایک مستقل مدرس جسے آئندہ سال بھی مدرسہ میں رکھنے کا ارادہ تھا، اس کا

شعبان یا رمضان میں انتقال ہو جائے، تو ان دو مہینوں کی تنخواہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب باسم ملہم الصواب: مدرسین سے عقد اجارہ مسانہہ ہے، لہٰذا بہر صورت ابتداء تقرر سے انتہاء رمضان تک پوری تنخواہ دی جائے گی، اہل مدرسہ پر لازم ہے کہ برطرفی کی اطلاع بروقت یعنی رجب کے آخر میں دیدیں، اگر اطلاع دینے میں تاخیر کی جیسا کہ سوال نمبر ۳ میں مذکور ہے، تو وہ گناہ گار ہوں گے، جس سے توبہ واستغفار لازم ہے۔(۱)

چند دن کام کر کے ملازمت چھوڑنے والے کو تنخواہ ملے گی یا نہیں؟

مدرسے کا ملازم یا مدرس کام کرنے کے لئے آیا اور چند دن مثلاً پانچ دن کام کر کے چلا گیا، جب کہ اس کا تقرر پورے سال کے لئے ہوا تھا، ملازم جو چھوڑ کر چلا گیا، وعدہ خلافی کرنے کی وجہ سے گناہ گار ہوگا اور جتنے دن کام کیا ہے، اتنے دنوں کی تنخواہ اس کو ملے گی، کیونکہ یہ اس کا حق ہے۔ احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: مدرسہ کا ملازم دو چار دن کام کر کے بلا اجازت چلا جاتا ہے، حالانکہ اس ملازم کا تقرر پورے سال کے لئے ہوا تھا، اس کے جانے کی وجہ سے مدرسہ کا سخت نقصان ہوتا ہے، اور باوجود اصرار کے وہ واپس نہیں آتا، اور جتنے دن کام کیا اس کی تنخواہ کا طالب ہے، کیا وہ تنخواہ کا مستحق ہے؟

الجواب باسم ملہم الصواب: اس ملازم پر حسب وعدہ پورا سال کام کرنا لازم ہے بلا عذر شرعی کام چھوڑنے کی صورت میں گناہ گار ہوگا، مگر جتنے دن کام کیا ہے، ان کی تنخواہ کا بہر حال مستحق ہوگا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (۲)

---

(۱) احسن الفتاویٰ: ۷/۲۸۲

(۲) احسن الفتاویٰ: ۷/۲۸۴

مدرس کو نااہلی کی وجہ سے فارغ کیا تو باقی مہینوں کی تنخواہ کا مستحق نہ ہوگا

اگر کسی مدرس کو انتظامیہ مدرسہ نے اس کی نااہلی کی وجہ سے رجب میں ہی فارغ کر دیا، یعنی وہ مدرس ایسا تھا جو اسباق پڑھانے کا اہل نہیں تھا، مجبوراً مہتمم صاحب نے اس کو فارغ کر دیا، تو ایسے مدرس کو پورے سال کی تنخواہ نہیں ملے گی، اور بلا وجہ شرعی کے رجب میں فارغ کر دیا، تو مدرس شعبان اور رمضان کی تنخواہ کا بھی مستحق ہوگا۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

''اگر مدرس کو واقعتاً نااہلیت کی بناء پر معزول کیا گیا ہے، تو وہ شعبان کی تنخواہ کا مستحق نہیں''۔(۱)

......اور مدرس نے ایام تعطیل میں کام نہیں کیا تو کیا حکم ہے؟

فتاوی دار العلوم دیوبند میں ہے:

سوال: (۳۴۳) زید ایک مدرسہ میں معلم ہے، شعبان میں حسب دستور امتحان سالانہ ہو چکا ہے، مدرسہ کے دیگر معلمین بھی تعطیل پر ہیں، صرف زید ہی مدرسہ میں مقیم ہے، مہتمم مدرسہ نے بعد امتحان زید سے کام شروع کرنے کو کہا، زید نے تعطیل عام کی مجبوری ظاہر کر کے کچھ تامل کیا، مہتمم نے ۳ رمضان کو شعبان کی تنخواہ زید کو دیدی، اس کے بعد زید مدرسہ میں ہی مقیم رہا، ۲۸ رمضان کو زید نے رمضان کی تنخواہ طلب کی، مہتمم مدرسہ نے یہ جواب دیا کہ تمہیں یہ تنخواہ لینا جب کہ تم نے کام نہیں کیا جائز نہیں، مہتمم مدرسہ کا یہ رویہ کہاں تک صحیح ہے؟ جب کہ انہوں نے اس سے پہلے کوئی اطلاع ملازمت سے علیحدہ کرنے

(۱) احسن الفتاوی: ۲۸٦/۷

کی نہیں کی۔

الجواب: اس صورت میں زید رمضان شریف کی تنخواہ کا مستحق ہے، کیونکہ رمضان شریف میں مدرسین ومعلمین مدارس عربیہ اسلامیہ کو عموماً تعطیل ہوتی ہے اور جب کہ قبل رمضان شریف مہتمم مدرسہ نے زید کو ملازمت سے علیحدہ ہونے اطلاع نہیں کی، تو ماہ رمضان شریف کی تعطیل کا وہ مستحق رہا، اور تنخواہ اس ماہ مبارک کی اس کو ملنی چاہیے، ۲۸ رمضان شریف کی اطلاع برطرفی زید کی تنخواہ رمضان شریف کو ساقط نہیں کرتی"۔(۱)

سفر حج کے زمانے کی تنخواہ کا حکم:

نظام الفتاویٰ میں ہے:

سوال: نمبر (۱۶۲۵) کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ ایک مولانا صاحب ایک مدرسہ میں مدرس ہیں، وہ فریضہ حج ادا کرنے کے واسطے تین ماہ کی چھٹی لے کر حج کرنے گئے، حج سے واپس آکر ان تین ماہ کی تنخواہ لینا چاہتے ہیں، آیا ان تین ماہ کے تنخواہ کے وہ مستحق ہیں، یا نہیں؟ اور ان کے واسطے لینا جائز ہے، یا نہیں؟ جواب عنائت فرما کر شکریہ کا موقع عنائت فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق: اگر سابق میں اس طرح کی تنخواہ دینے کی نظیر اس مدرسہ میں موجود ہو، جب تو اس تنخواہ کے دینے میں کوئی کلام ہی نہیں اور اگر اس مدرسہ میں اس کی نظیر موجود نہیں، لیکن اگر قرب وجوار کے مدارس دینیہ

(۱) فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲۷۱/۱۵

میں اس طرح دینے کا رواج موجود ہے، تب بھی اس تنخواہ کے دینے میں کوئی شبہ نہیں اور اگر ایسا بھی نہیں ہے، تو پھر چونکہ اراکین و ذمہ داران انتظامیہ قوم کے وکیل ہوتے ہیں، اگر وہ عوام کی زبوں حالی کی بنیاد پر دینا چاہئیں، تو دے سکتے ہیں، اس طریقہ کار کی نظیر اپنے اکابر کے مدارس میں مل سکتی ہے۔(۱)

کیا امام کو چھٹی کا حق حاصل ہے؟

فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ہے:

''فتاوی شامی کی کتاب الوقف میں ہے کہ امام کے لئے اپنی ضروریات یا راحت کے لئے ایک ہفتہ یا اس کے قریب یعنی پندرہ دن سے کم تک غیر حاضری عرفاً وشرعاً جائز ہے، پھر آگے تصریح ہے کہ سال بھر میں ہفتہ دو ہفتہ غیر حاضری ہو، تو معاف ہے، لہٰذا اس سے یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ امام کی کبھی کبھی غیر حاضری معاف ہے''۔(۲)

کچھ نمازیں پڑھانے پر پوری تنخواہ لینا:

امام اگر پوری نمازیں نہ پڑھاتا ہو اور معاہدہ میں یہ طے ہوا ہو کہ تنخواہ پوری لے گا، تو اس کے لئے پوری تنخواہ لینا جائز ہے، لیکن اگر معاہدہ پانچ نمازیں پڑھانے کا ہوا ہو اور دو یا تین نمازیں پڑھاتا ہو، تو اس صورت میں اس کے لئے پوری تنخواہ لینا جائز نہیں، جتنی نمازیں پڑھاتا ہو، ان نمازوں کی تنخواہ لے سکتا ہے۔(۳)

---

(۱) نظام الفتاوی:(۲/ ۳۷۰)۔ط مکتبہ رحمانیہ

(۲) فتاوی دار العلوم دیوبند :(۳/ ۸٤)

(۳) ھکذا فی احسن الفتاوی، کتاب الاجارۃ:(۷/ ۲۷۸)

کیا امام چوبیس گھنٹے کا پابند ہے؟

امام ومؤذن جو تنخواہ لیتے ہیں، وہ اجیر کے حکم میں ہیں، لہٰذا اگر امام ومؤذن سے متولی کا چوبیس گھنٹے کا معاہدہ ہوا ہو، تو اس کے مطابق عمل کرنا ہوگا، اور اگر اس قسم کا کوئی معاہدہ نہیں ہوا، تو ایسی پابندی ظلم و ناجائز ہے۔

امام کا فارغ اوقات میں کوئی دوسری ملازمت کرنا:

امام صرف نمازیں پڑھانے کے لئے مقرر ہوا ہو، تو فارغ اوقات میں امام کوئی دوسرا کام یا کسی دوسری جگہ ملازمت کرسکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے:

سوال: (۴۳) زید بغرض امامت مسجد ملازم رکھا گیا جس کو ستر (۷۰) اسی (۸۰) روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے، اس کے علاوہ وہ دس بجے سے چار بجے تک سرکاری مدرسہ میں ملازمت کرسکتا ہے، یا نہیں؟

الجواب: شرعاً اس کی ممانعت نہیں ہے کہ امام مسجد تنخواہ دار سوائے اوقات نماز کے فارغ اوقات میں کوئی دوسری ملازمت، یا کسب کرے۔(۱)

مہتمم مدرسہ کا مدرس کے لئے یہ شرط لگانا کہ مدرس اور کوئی کام نہیں کرے گا، یہ شرط فاسد ہے، مدرس اسباق سے فارغ ہوکر دوسری جگہ ملازمت بھی کرسکتا ہے، کسی دوسری جگہ کام بھی کرسکتا ہے، مہتمم مدرسہ کا مدرس کو پابند بنانا ٹھیک نہیں ہے، البتہ اس بات کا خیال مدرس کے لئے رکھنا ضروری ہے کہ دوسری ملازمت یا کام کی وجہ سے مدرسہ کے اوقات اور اسباق میں کوتاہی نہ ہو۔

---

(۱) فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۱۵/ ۲۷۵_اجارے کا بیان

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''اس سلسلے میں احقر (عفا اللہ عنہ وعافاہ) کی بھی رائے یہ ہے کہ مدرس کو اوقات کار (اوقات اجارہ) کے بعد اپنا پابند بنانا شرط فاسد ہے، اسی طرح اوقات کار چھ یا آٹھ گھنٹوں کے بجائے چوبیس گھنٹے متعین کر کے ملازم کو مسلسل دن رات کا پابند بنانا شرط فاسد ہے اور اس میں کئی طرح کی قباحتیں ہیں:

۱): ملازم اور غلام میں کام اور وقت کے متعین ہونے اور نہ ہونے کا ہی فرق ہے، اور پابندی کی یہ شرط اشبہ بالا جارہ نہیں، البتہ اگر یہ اجارہ نہ ہوتا، بلکہ نفقہ ہوتا تو شاید اس کی گنجائش ہوتی، کیونکہ زوجہ کسی وقت اطاعت بعل سے انکار نہیں کرسکتی (الا العذر شرعی) اور امیر المؤمنین بھی کسی وقت مصالح المؤمنین سے اغماض نہیں کرسکتا، مگر فی الوقت مدارس میں اجارۂ محضہ کی صورت رائج ہے۔

۲): یہ وہ شرط ہے جس پر عمل کرنا مشکل، بلکہ تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے، لہٰذا اس شرط کو تسلیم کرنا اور کرانا گناہ میں مبتلا ہونا اور گناہ میں مبتلا کرنا ہے۔

۳): یہ سلف صالحین کے تعامل کے خلاف ہے، دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور اور تھانہ بھون میں اس کے خلاف ہی تعامل رہا ہے، اور مدرسین فارغ اوقات کو اپنے جملہ مشاغل حتیٰ کہ کاروباری مصروفیات میں صرف کرتے رہے ہیں، اکابر کے واقعات اس پر شاہد ہیں، بلکہ یہ مصروفیات اسلامی معاشرے میں علماء کی شمولیت اور برکت کی حامل رہی ہیں۔

۴): یہ شرط بظاہر مفسد اجارہ بھی ہے، کیونکہ مقتضائے عقد اجارہ کے خلاف بھی

ہے، اور غیر معروف بھی، بلکہ غیر معمول بھی، البتہ چونکہ اس شرط پر عمل کرنا چونکہ ناممکن ورنہ مشکل ضرور ہے، اس لئے اگر اس شرط کو فاسد قرار دے کر اجارہ کو صحیح قرار دیا جائے، تو بھی کچھ بعید نہیں۔

۵): علامہ شامیؒ کی عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدرس اجارہ کو اوقات کار کے بعد طلب معاش کی اجازت ہونی چاہئے، کیونکہ انہوں نے ساکنین مدرسہ کو جن کا وظیفہ اور نفقہ وقف کی طرف سے متعین ہو طلب معاش کے لئے سفر کی اجازت دی ہے، اور اسے عذر شرعی قرار دیا ہے اور اس سفر کی بناء پر اس کا وظیفہ متعینہ ساقط نہ ہونے کا حکم ذکر کیا ہے، علامہ شامیؒ کی عبارت درج ذیل ہے:

(قوله ونظم ابن شحنه الغيبة الخ)أقول حاصل م في شرحه تبعا للبزازية أنه إذا غاب عن المدرسة فأما أن يخرج من المصر أو لا ، فإن خرج مسيرة سفر ، ثم رجع ليس له طلب ما مضى من معلومه ، بل يسقط ، وكذا لو سافر لحج ونحوه ، وإن لم يخرج لسفر ، فإن خرج إلى الرستاق ، فإن أقام خمسة عشر يوما فأكثر فإن بلا عذر كالخروج للتنزه فكذلك ، وإن لعذر ، كطلب المعاش فهو عفو ، إلا أن تزيد غيبته على ثلاثة أشهر ، فلغيره أخذ حجرته ووظيفته أى معلومه ، وإن لم يخرج من المصر فإن اشتغل بكتابة علم شرعى فهو عفو ، وإلا جاز عزله أيضا ، واختلف فيما إذا خرج للرستاق ، وأقام دون خمسة عشر يوما لغير عذر ، فقيل يسقط ، وقيل لا ، هذا حاصل ما

ذكره ابن الشحنة في شرحه ـ

وملخصه أنه لا يسقط معلومه الماضي ولا يعزل في الآتي ، إذا كان في المصر مشتغلا بعلم شرعي أو خرج لغير سفر وأقام دون خمسة عشر يوما بلا عذر على أحد القولين ، أو خمسة عشر فأكثر ، لكن لعذر شرعي كطلب المعاش ولم يزد على ثلاثه اشهر"۔ (۱)

شامی کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ سال میں تین ماہ یعنی ربع سے کم طلب معاش کی اجازت ہے، اگر چہ اس کا وظیفہ بحیثیت ساکن مدرسہ طے شدہ اور جاری ہو، اور اس طلب معاش کی وجہ سے نہ اس کا وظیفہ ساقط ہوگا اور نہ وہ مستحق عزل ہوگا۔

اگر چہ علامہ شامیؒ کی بیان کردہ یہ تفصیل ایک خاص صورت کے بارے میں ہے، جس کی وضاحت خود علامہ شامیؒ نے درج ذیل عبارت سے کی ہے:

"وهذا التفصيل المذكور في الغيبة إنما هو فيما إذا قال وقفت هذا على ساكني مدرستي وأطلق ، أما لو شرط شرطا تبع كحضور الدرس أياما معلومة في كل جمعة فلا يستحق المعلوم إلا من باشر خصوصا إذا قال من غاب عن الدرس قطع معلومه فيجب اتباعه"۔ (۲)

لیکن علامہ شامیؒ کی عبارت سے یہ امر ضرور واضح ہوا کہ طلب معاش ایک

(۱) رد المحتار: ٤/٤١٨ كتاب الوقف

(۲) رد المحتار: ٤/٤١٩

عذر شرعی ہے اور مال وقف میں اس کی رعایت کا حکم ہے، تو مدارس میں اس عذر شرعی کی رعایت بطریق اولیٰ ہونی چاہئے، البتہ یہ امر بہر حال لازم ہے کہ مدرس اجارہ کے لئے طلب معاش کا یہ عمل محض ضمنی ہو، مقصودی نہ ہو، اور اس کی وجہ سے مدرس کے اوقات اجارہ اور عمل اجارہ میں کسی قسم کی اختیاری کوتاہی واقع نہ ہو۔(۱)

(۱) فتاویٰ عثمانی: ۳۶۹/۳

باب......(۷)

ملازمت کی متفرق صورتیں اور ان کے شرعی احکام

ملازم سے بوقت معاہدہ حلفیہ عہد و پیمان لینا

بعض مالک اپنے ملازمین سے حلفیہ عہد و پیمان لیتے ہیں، مثلاً ملازم یہ قسم اٹھاتا ہے کہ میں کسی قسم کی نافرمانی نہیں کروں گا، کام میں سستی وغیرہ نہیں کروں گا، مالک کے لئے ایسا کرنا جائز ہے، عموماً مالک اپنی تسلی کے لئے ایسا کرتا ہے، مالک کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ ملازم کام میں سستی نہ کرے اور پابندی سے اپنا کام انجام دے۔ ملازم کے لئے ایسی قسم اٹھانا جائز ہے، البتہ چونکہ اکثر و بیشتر ایسی قسمیں توڑ دی جاتی ہیں، اس لئے بہتر یہ کہ ایسے عہد و پیمان میں ملازم عہد یا حلف لیتے وقت انشاء اللہ کہہ دے، تاکہ خلاف ورزی کی صورت میں گنہگار نہ ہو۔

غلط عمر لکھ کر ملازمت کی تنخواہ لینا:

ہمارے ہاں لوگ بچوں کی عمر فارب ''ب'' میں کم لکھواتے ہیں، تاکہ مستقبل میں اس کے کچھ فوائد حاصل ہوں، مثلاً ریٹائرمنٹ کی عمر میں دو یا تین سال کا اضافہ ہوجانا فطری بات ہے، عمر کم لکھوانے کی وجہ سے دو یا تین سال کی اضافی تنخواہ اس کو ملے گی، اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ اس طرح کرکے جھوٹ لکھنے کا گناہ ہمیشہ اس کے سر رہے گا، البتہ اگر نفس کام

حلال ہو، اور مکمل ایمانداری سے کام سرانجام دیتا ہو، تو اس کی تنخواہ حلال ہی ہوگی، تنخواہ حرام نہیں ہوگی۔

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

سوال: پاکستان میں عموماً حضرات اپنے بچوں کی عمر کم لکھواتے ہیں، تاکہ مستقبل میں فائدے ہوں، مثلاً ریٹائر ہونے کی عمر میں دو یا تین سال کا ناجائز اضافہ ہوجاتا ہے، اب مسئلہ یہ ہے کہ اس اضافے سے جو تنخواہ ملتی ہے، کیا وہ جائز ہے یا ناجائز؟ کیونکہ وہ زائد سال کسی اور کا حق ہے جو عمر بڑھوا کر کسی شخص نے حاصل کئے۔

جواب: تنخواہ تو خیر حلال ہے، اگر کام حلال ہو، مگر جھوٹ کا گناہ ہمیشہ سر رہے گا۔(١)

جعلی سرٹیفکیٹ کے ذریعے ملازمت اور اس کی آمدنی:

آج کل اس کا رواج چل پڑا ہے کہ لوگ پیسے دے کر جعلی اسناد اور سرٹیفکیٹ بنا لیتے ہیں، اور پھر انہی اسناد پر کسی جگہ ملازمت اختیار کر لیتے ہیں، تو کیا جعلی اسناد کی بنیاد پر حاصل ہونے والی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟ اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کا کیا حکم ہے؟

جعلی اسناد بنانا ہرگز جائز نہیں ہے، اور نہ ہی کسی ادارے کے سربراہ کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ رشوت لے کر کسی کو جعلی اسناد بنا کر دے، بلکہ یہ جعل سازی، جھوٹ اور دھوکہ کئی گناہوں کا مجموعہ ہے، لیکن ان اسناد کی بنیاد پر وہ جو ملازمت کر رہا ہے، اس کام کو جانتا بھی ہو اور وہ کام محنت سے کرتا ہوں، وقت کی پابندی کرتا ہوں، اور اس میں کمی کوتاہی نہ کرتا ہو اور وہ شخص اس منصب کا اہل بھی ہو، تو پھر ایسی ملازمت سے حاصل ہونے والی تنخواہ حلال

(١) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ٢٨٧/٨

ہوگی، البتہ جھوٹ دھوکہ کا گناہ اس کے سر ہمیشہ رہے گا۔لیکن اگر یہ شخص اس منصب کا اہل ہی نہ ہو، یا کام صحیح طرح جانتا نہ ہو، تو اس وقت اس کی تنخواہ حرام ہوگی۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: کسی کو ایک ملازمت مل رہی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ پانچویں جماعت کا سرٹیفکیٹ ہو، وہ ان کے پاس نہیں، مگر جعلی بن سکتا ہے، تو اس صورت میں کوئی گناہ ہے یا نہیں؟ نیز اس کی اس معاملہ میں اعانت کرنے والوں پر گناہ ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح ویلڈنگ وغیرہ کام کی مہارت کا جعلی سرٹیفکیٹ حاصل کر کے ملازمت حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس پر ملنے والی تنخواہ حلال ہوگی یا حرام؟

الجواب باسم ملہم الصواب: یہ جھوٹ اور دھوکہ ہے، لہٰذا جائز نہیں۔ اس کی اعانت کرنے والے بھی گناہ گار ہوں گے، البتہ جو کام اس کے ذمے ہے اگر وہ اسے بحسن وخوبی انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، تو تنخواہ حلال ہے۔(۱)

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

سوال: ایک شخص غیر مستحق ہونے کے باوجود Cast Backward سرٹیفکیٹ حاصل کرتا ہے، اور اس کو ملازمت بھی مل جاتی ہے، کیا اس ملازمت کے ذریعہ حاصل شدہ مال کے ذریعہ حج کر سکتا ہے؟ وہ مال اس کیلئے حلال ہے، یا حرام؟

جواب: غلط سرٹیفکیٹ بنانا گناہ ہے، کیوں کہ یہ جھوٹ بھی ہے اور دھوکہ بھی، لیکن چوں کہ یہ اجرت عمل اور محنت کا معاوضہ ہے اور عمل پر اجرت حاصل کرنا جائز وحلال طریقہ ہے، اسلئے اس کی آمدنی حلال ہی متصور ہوگی، نہ کہ حرام،

(۱)احسن الفتاویٰ: ۸/ ۱۹۸

اس لئے اس رقم سے حج کرنا درست ہے، البتہ اسے اپنے اس جھوٹ پر توبہ کرنی چاہئے۔(۱)

مولانا یوسف لدھیانویؒ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

جواب: جھوٹ اور جعل سازی کے ذریعہ کوئی عہدہ و منصب حاصل کرنا یہ تو ظاہر ہے کہ حرام ہے، جھوٹ، دغابازی اور فریب دہی پر جتنی وعیدیں آئی ہیں یہ شخص ان کا مستحق ہے، مثلاً جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ دھوکہ کرنے والا ہم میں سے نہیں ہے، اس لئے جعل سازی خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، ایسے شخص کے بدکار، گناہ گار ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہئے۔

باقی رہا یہ مسئلہ کہ ایسے شخص کی کمائی بھی حلال ہے یا نہیں؟ اس کے لئے یہ اصول یاد رکھنا چاہئے کہ اگر یہ شخص اس منصب کی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے اور کام بھی صحیح کرتا ہے، تو اس کی تنخواہ حلال ہے، اور اگر منصب کا سرے سے اہل ہی نہیں، یا کام ٹھیک سے انجام نہیں دیتا، تو اس کی تنخواہ حرام ہے، اس اصول کو وہ صاحب ہی نہیں بلکہ تمام سرکاری و غیر سرکاری افسران و ملازمین پیش نظر رکھیں، میرے مشاہدہ و مطالعہ کی حد تک ہمارے افسران و ملازمین میں سے پچاس فیصد حضرات ایسے ہیں جو یا تو اس منصب کے اہل ہی نہیں، محض سفارش یا رشوت کے زور سے اس منصب پر آئے ہیں، یا اگر اہل ہیں تو اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر نہیں بجالاتے، ایسے لوگوں کی تنخواہ حلال نہیں، وہ خود بھی حرام کھاتے ہیں اور گھر والوں کو بھی حرام کھلاتے ہیں۔(۲)

---

(۱) کتاب الفتاویٰ: ۵/ ۳۹۷ ۔زمزم پبلشرز

(۲) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۸/۲۸۹

اسی طرح بعض لوگ ملازمت حاصل کرتے ہوئے جھوٹ بول کر ملازمت حاصل کر لیتے ہیں، مثلاً ملازم کے لئے انٹر پاس ہونے کی شرط رکھی گئی، اور کسی نے جھوٹ بول کر اپنے آپ کو انٹر پاس ظاہر کیا، حالانکہ وہ انٹر پاس نہ ہو، جھوٹ بول کر ملازمت حاصل کی، تو اس کا بھی یہی حکم ہے، جو جعلی سند کے ذریعے حاصل کی گئی ملازمت کا ہے، اس میں ملازم کو جھوٹ بولنے کا گناہ ہوگا، لیکن اگر کام کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس کا اہل ہو، تو اس سے حاصل ہونے والی تنخواہ حلال ہوگی۔

ادارہ میں ملازمت کے لئے جھوٹی سند دینا:

سوال: [۸۹۵۹] میں جس ادارہ میں ہوں، وہاں کچھ حضرات ایسے آتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے یہاں کے ادارہ میں ماسٹر رکھادو، اور تصدیقی سند لکھ دو، تاکہ ہم پرائیویٹ طور پر امتحان دے سکیں حالانکہ یہ تحریر بالکل جھوٹی ہوگی، جبکہ جھوٹ حرام ہے، اس لئے میرے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جو شخص آپ کے ادارہ میں ملازم نہیں، اس کو ملازم دکھانا اور سند دینا جھوٹ ہے، مکر ہے، شرعاً اس کی اجازت نہیں۔(۱)

ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ سند ایک گواہی ہے اور جعلی سند دینا جھوٹی گواہی دینے کے مترادف ہے، جس کی صراحۃً ممانعت آئی ہے، جس کو اللہ کے نبی ﷺ نے کبیرہ گناہوں میں سے شمار کیا ہے۔

فرضی ملازم ظاہر کرکے ادارے سے اس کی تنخواہ وصول کرنا:

بعض محکموں کی طرف سے ادارے کے ملازمین کو گھر کے کام کاج کرنے کے لئے ایک

(۱) فتاویٰ محمودیہ جدید: ۴۷۷/۱۸

ملازم رکھنے کی اجازت ہوتی ہے، جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ملازم کسی شخص کے مکمل کاغذات جس کو وہ گھر میں ملازم رکھنا چاہتا ہو، اپنے ادارے میں جمع کراتا ہے، ادارے والے جانچ پڑتال کر کے اپنے ملازم کو اس بات کی اجازت دے دیتے ہیں، کہ تم اس کو اپنے ہاں ملازم رکھ سکتے ہو، اس کے بعد اس ملازم کی تنخواہ محکمے والے اپنے ملازم کے واسطے سے اس کو دیتے ہیں، اگر اس شخص نے واقعۃً ملازم رکھا ہو جو اس کے گھر کے کام کاج کرتا ہو، اور اس ملازم کی تنخواہ اپنے ادارے یا محکمے سے وصول کرتا ہو، تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، یہ بالکل جائز ہے۔

لیکن عموماً ایسا ہوتا ہے کہ یا تو اس ملازم کو فارغ کر دیا جاتا ہے، جب کہ اس کی تنخواہ مسلسل وصول کی جاتی ہے، شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے، یہ محکمہ کے ساتھ دھوکہ ہے اور جھوٹ ہے، ملازم کے نام تنخواہ وصول کر کے خود استعمال کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ ایسی تنخواہ محکمے کو واپس کرنا ضروری ہے۔

اور بعض دفعہ اس ملازم کو فارغ کر کے کم تنخواہ والا ملازم رکھ لیا جاتا ہے، اور تنخواہ اس کی وصول کی جاتی ہے، یہ بھی شرعاً جائز نہیں، ہاں اگر اس کے کاغذات جمع کرا کے اس کے نام پر وصول کرے، تب تو جائز ہے، ورنہ جائز نہیں ہے۔

البتہ یہ صورت جائز ہے کہ محکمے کی طرف سے اپنے ہر ملازم کو گھر میں کام کرنے والے ملازم کی تنخواہ ملتی ہو، چاہے وہ ملازم رکھیں یا نہ رکھیں، یعنی محکمے کی طرف سے پابندی نہ ہو، وہ ایک ملازم کی تنخواہ اپنے ہر ملازم کو دیتے ہوں، باقی اس کی مرضی ہے چاہے وہ ملازم گھر کے لئے رکھے یا نہ رکھے، تو اس صورت میں تنخواہ لینا جائز ہوگا، کیونکہ اس میں جھوٹ یا دھوکہ وغیرہ نہیں ہے۔

ملازم کے لئے اصل بل سے زائد خرچہ وصول کرنا جائز نہیں ہے:

محکمے یا ادارے کی طرف سے جب ملازم محکمے کا کوئی کام سرانجام دے، تو عموماً اس کی دو

صورتیں بنتی ہیں:

۱)......ایک یہ کہ محکمہ ملازم کو رقم دے دیتا ہے کہ فلاں کام کر کے لاؤ، ملازم کام کر کے وہ چیز خرید کے لے آتا ہے، اس کا بل محکمے کو دکھا کر زائد رقم واپس کر دیتا ہے، مثلاً جنریٹر خریدنے کے لئے محکمے کی طرف سے ملازم کو پچاس ہزار ملے، اس نے ۴۵۰۰۰ ہزار میں جنریٹر خریدا، دکاندار نے بل بھی ۴۵۰۰۰ ہزار کا بنایا، ملازم نے بل کے مطابق بچی ہوئی رقم محکمے کو واپس کی، اس صورت میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ باقی بچی ہوئی رقم محکمے کو واپس کرنا لازم ہے، غلط بل بنا کر زائد رقم دبا لینا ہرگز جائز نہیں، یہ محکمے کے ساتھ خیانت ہے۔

۲)......دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ملازم وہ سامان خرید کے لے آتا ہے، اس کے بل کی تصدیق کرا کر محکمے سے ہونے والا خرچہ وصول کرتا ہے، اس صورت میں ملازم نے جتنے کا سامان خریدا ہے، محکمے سے اتنی رقم وصول کرنا شرعاً جائز ہے، یہ اس کا حق ہے، لیکن اس سے زیادہ رقم کا بل بنانا، اور اس کی تصدیق کرا کر محکمے سے زائد رقم وصول کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اس صورت میں ماتحت افسر سے بل کی تصدیق کرائی جاتی ہے، ماتحت افسر کے لئے بھی اصل رقم سے زیادہ کی تصدیق جائز نہیں ہے، یہ تعاون علی المعصیت ہے، جو ناجائز ہے دوسرے کی دنیا کے لئے اپنی آخرت تباہ کرنے کے مترادف ہے۔

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

> سوال: میں گورنمنٹ میں ملازم ہوں اور جب سرکاری کام کے لئے فوٹو کاپی کروانی ہوتی ہے، تو چپراسی مطلوبہ کاپیوں سے زیادہ رقم رسید پر لکھوا کر لاتا ہے اور مجھے ایک فارم پُر کر کے اس رسید کے ساتھ اپنے ماتحت افسر سے تصدیق کرانی ہوتی ہے، کیا اس گناہ میں میں بھی شریک ہوں، حالانکہ میں اس زائد رقم سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتا؟

جواب: گناہ میں تعاون کی وجہ سے آپ بھی گناہ گار ہیں اور دوسروں کی دنیا کے لئے اپنی عاقبت برباد کرتے ہیں۔(۱)

کمپنی کی طرف سے خریداری کیلئے جانے والے ملازم کو ملنے والی رقم کا حکم

سوال: ایک شخص خریداری کے محکمے میں کام کرتا ہے، جب وہ کمپنی کے لئے خریداری کے سلسلے میں شرکہ جاتے ہیں، تو شرکہ والے کمپنی کو کچھ پرافٹ دیتے ہیں، اس کے ساتھ جو خریداری کے لئے جاتے ہیں، ان کو بھی کچھ دیتے ہیں، تو کیا ان کے لئے یہ رقم لینی جائز ہے یا نہیں؟ یہاں کا یہ ایک اصول ہے کہ وہ شخص جو خریداری کے لئے جاتا ہے، وہ کسی قسم کی ڈیمانڈ نہیں کرتا۔

الجواب حامدا ومصلیا: اگر مذکورہ ملازم محکمہ کی جانب سے خریداری خوب ٹھیک بجا کر کرتا ہے، ملنے والی اس رقم کی وجہ سے مال کی خرابی پر نہ کوئی رعایت کرتا ہے اور نہ چشم پوشی کرتا ہے، بلکہ جہاں اچھا اور عمدہ مال ملتا ہے، وہاں سے خریداری کرتا ہے اور رقم لینے کی صراحۃً یا اشارۃً بالکل کوئی فرمائش نہیں کرتا، تو ملازم کو یہ رقم لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، پھر بھی احتیاط نہ لینے میں ہے، کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی سے یہ رقم رشوت بن جائے گی۔

دھوکہ دے کر اصل گرانٹ سے زیادہ وصول کرنا:

سوال: اگر کوئی مسلم ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ کی گرانٹ زیادہ حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل امور کا ارتکاب کرے، تو شرعا اس کی کیا سزا ہے؟

(۱) اسکول کے ادنیٰ ملازمین کو بالکل تنخواہ نہ دے، مگر ان کی تنخواہ اسکول کے رجسٹروں میں دکھائے اور ان کے جعلی دستخط یا انگوٹھے لگوالے۔

---

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ٦/٦٤

(۲) بعض ملازمین کے دستخط تو زیادہ تنخواہ پر کرائے، مگر دراصل کم دے۔

(۳) اسکول کے سارے اخراجات میں فرضی بل بنوا کر درج کرے۔

(جواب ۳۴۱) یہ خلاف واقعہ فرضی کروائیاں کرنا شرعاً قانوناً اخلاقاً ہر طرح جرم ہے اور مرتکب مجرم ہے، اس کی تعزیر حاکم وقاضی کی رائے پر محمول ہے۔(۱)

گھر میں کام کرنے والے ملازم سے پردہ کرنا فرض ہے:

ہمارے ہاں عام طور پر گھروں میں کام کرنے والے ملازمین سے عورتیں پردہ نہیں کرتی بلکہ بہت سے ملازم نوجوان ہوتے ہیں، جو دن رات گھر میں رہتے ہیں، اہل خانہ ان ملازمین سے پردہ بالکل نہیں کرتے، بلکہ مالک اہل خانہ کے ساتھ ملازم کو چھوڑ کر کئی ہفتے بلکہ مہینوں تک گھر واپس نہیں آتے، یہ بہت بے شرمی اور بے غیرتی کی علامت ہے، شرعاً ان سے پردہ کرنا لازم اور ضروری ہے، کیونکہ ملازم غیر محرم ہو، تو جس طرح ایک مسلمان عورت کے لئے باقی غیر محرم مردوں سے پردہ کرنا فرض ہے، اسی طرح گھر میں کام کرنے والے ملازم سے بھی پردہ کرنا فرض ہے، لوگ اس کو معمولی سمجھ کر درگزر کرتے ہیں، جو بڑی ہلاکت کا سبب بنتا ہے، البتہ اگر ملازم چھوٹا نابالغ بچہ ہے، یا محرم رشتہ دار ہے، تو پھر اس سے پردہ فرض نہیں ہے، عورت اس کے سامنے جاسکتی ہے۔

عورت کو اپنے پالے ہوئے ملازم سے پردہ کرنا فرض ہے:

کفایت المفتی میں ہے:

سوال: (۱) کیا ایک عورت بالغہ کا ایک بالغ ملازم ہے، جو اس کا اپنا بچوں کی

---

(۱) کفایت المفتی: ۳۳۴/۷

طرح پالا ہوا ہے، اپنے جسم کے سوائے پستان اور شرمگاہ کے تمام جسم کے حصے پر بالغ ملازم کا ہاتھ لگوا سکتی ہے یعنی بالغ ملازم اپنی بالغہ مالکن کی ٹانگیں، رانیں، بازو اور سر کو دبا سکتا ہے اور ایسی عورت کی عبادت عبادت ہو سکتی ہے اور اس میں خدا کی ناراضگی تو نہیں ہے؟

(۲) کیا ایک بالغ ملازم اپنی بالغہ مالکہ کے پاس تنہائی میں اس کے تمام جسم پر سوائے چھاتیوں اور شرمگاہ کے ہاتھ لگا سکتا ہے اور اس کے پاس نزدیک والی چارپائی پر سو سکتا ہے؟

(۳) کیا ایک بالغہ مالکہ اپنے بالغ ملازم کو اپنے سینہ سے لگا سکتی ہے اور اس کا یہ فعل احکام خداوندی کے خلاف تو نہیں اور ایسی عورت کی عبادت عبادت کہی جا سکتی ہے؟

جواب: (۳۸۵) یہ سب صورتیں ناجائز اور حرام ہیں۔(۱)

اسی طرح بعض خواتین اپنے ڈرائیور ملازم کے ساتھ تنہائی میں سفر کرتی ہیں، شرعاً اپنے ڈرائیور کے ساتھ اکیلے سفر کرنا جائز نہیں ہے، ہاں اگر ساتھ کوئی اور ہو، مثلاً دو خواتین ہوں، تو جائز ہے، اس لئے کہ ڈرائیور کے ساتھ تنہا سفر کرنے کی صورت میں خلوت بالاجنبی لازم آتی ہے، جو ناجائز اور حرام ہے۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

''اگر گاڑی میں دو یا زیادہ لڑکیاں ہوں، تو ڈرائیور کے لئے لانا لے جانا جائز ہے، ایک لڑکی کو لانا لے جانا جائز نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں خلوت بالاجنبیہ لازم آتی ہے''۔(۲)

---

(۱) کفایت المفتی: ۹/ ۲۶۰

(۲) احسن الفتاویٰ: ۸/ ۵۰

ملازمت کے لئے اعضاء مستورہ کا معائنہ:

اس زمانے میں بعض ملازمتوں کے لئے امیدوار کا مکمل جسمانی معائنہ کیا جاتا ہے اور ڈاکٹر اس کا تمام بدن ننگا کر کے دیکھتا ہے اور ہاتھ سے جس جگہ چاہے ٹٹولتا بھی ہے، شرعاً چونکہ ضرورت شدیدہ کے بغیر کسی کے ستر کو کھولنا اور اس کی طرف نظر کرنا حرام ہے اور پھر اسے ٹٹولنا اور بھی زیادہ شنیع اور برا ہے، لہٰذا نجی اور سرکاری سطح پر ایسا قانون بنانے سے احتراز لازمی ہے، شرعاً ایسا قانون بنانا جائز ہی نہیں ہے، ڈاکٹر اور امیدوار کو بھی اس سے بچنا ضروری ہے اور اگر ایسا قانون واقعتاً ضروری ہو تو ہر امیدوار کے لئے اس کو لازمی نہ قرار دیا جائے، بلکہ جس امیدوار کا قرائن سے کسی شدید مرض میں مبتلا ہونا ثابت ہو جائے، صرف اس کے لئے اس معائنہ کو لازمی قرار دیا جائے۔

کفایت المفتی میں ایک سوال کے جواب میں مفتی کفایت اللہ دھلویؒ فرماتے ہیں:

''ستر کھولنا بلا ضرورتِ شدیدہ کے حرام ہے، پس ڈاکٹر معائنہ جس میں ستر کھول کر دیکھنا پڑے، بلکہ ہاتھ لگا کر دیکھے، اس وقت تک جائز نہیں ہوگا، جب تک قرائن سے ملازم کا کسی شدید مرض میں مبتلا ہونا ثابت نہ ہو جائے۔''(۱)

احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: حکومت نے ایئر فورس میں مذہبی تعلیم کے سلسلے میں ایک نیا شعبہ کھولا ہے، جس میں علماء کو وارنٹ افیسر (ریلیجس ٹیچر) کے عہدہ پر بھرتی کیا جاتا ہے، سرکاری قانون یہ ہے کہ بھرتی کے وقت طبی معائنہ کروانا ضروری ہے، جس میں ستر کھولنا لازمی ہے، کیا مذکورہ صورت میں ستر کھولنا اور اعضاء مخصوصہ

---

(۱) کفایت المفتی: ۲۶۵/۹

کا معائنہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب باسم ملہم الصواب: یہ کوئی ایسی ضرورت نہیں جس کی بناء پر کسی کے سامنے ستر کھولنے کی اجازت ہو، تعجب اور افسوس کا مقام ہے کہ جن لوگوں کو مذہبی تعلیم کے لئے لیا جارہا ہے، ان کو مذہب کے خلاف کرنے پر مجبور کیا جارہا ہے، جولوگ ملازمت کے لئے ایسے گناہ کبیرہ اور حرام کے ارتکاب پر تیار ہوں گے، وہ مذہب کی تعلیم جو کچھ دیں گے، وہ ظاہر ہے، ایسے لوگوں سے مذہب کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان ہی پہنچے گا۔

بہرکیف بلاضرورت شدیدہ کسی کو ستر دکھانا اور دیکھنا سخت گناہ اور حرام ہے اور سوال میں مذکورہ صورت ضرورت شدیدہ میں داخل نہیں۔(۱)

ملازم کی کوتاہی پر مالی جرمانہ:

کسی بھی ادارہ میں ملازمین سے غلطی، غفلت اور کوتاہی ہو جانے پر بطور سزا ان پر مالی جرمانہ عائد کرنا اور ان سے جرمانے کی یہ رقم وصول کرنا جمہور فقہاء کے نزدیک جائز نہیں ہے اس لئے ملازمین کی غفلت اور کوتاہی دور کرنے اور انہیں کام کا پابند بنانے کے لئے مالی جرمانہ عائد کرنے کے علاوہ کوئی اور ضابطہ اور طریقہ کار مقرر کرنا چاہئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت میں کسی بھی فرد کا مال اس کی دلی رضامندی کے بغیر دوسروں کے لئے حلال نہیں ہے، اسی بناء پر فقہ حنفی میں مالی جرمانہ کو ناجائز کہا گیا ہے اور مالی جرمانے کو اکل بالباطل (دوسروں کا مال ناجائز طریقے سے کھانا) کے حکم میں شمار کیا گیا ہے، چنانچہ درمختار میں ہے:

"(قوله لا يأخذ مال في المذهب) وفي الشاميه والحاصل إن المذهب عدم التعزير بأخذ المال"۔(۲)

(۱) احسن الفتاوی:۸/۱۸۷

(۲) الدر المختار، مطلب في التعزير باخذ المال:۴/۶۱۔ط سعيد كمبني

لیکن اگر کسی بھی کوشش اور ضابطے سے معاملہ قابو میں نہ آئے اور مالی جرمانہ عائد کیے بغیر اصلاح احوال کی کوئی اور صورت ممکن نہ رہے، تو ایسی مجبوری کی صورت میں امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق مالی جرمانہ لگانے کی گنجائش ہے اور ایسی صورت میں ملازم کے لئے جرمانہ ادا کرنا جائز ہے۔

البتہ اس میں یہ ضروری ہے کہ ادارہ جرمانہ کی رقم وصول کر کے استعمال نہ کرے، بلکہ الگ رکھے اور جب ملازم اپنی اصلاح کر لے، سستی اور غفلت چھوڑ دے اور آئندہ ایسی کوتاہی سے توبہ کر لے، تو سابقہ وصول شدہ جرمانے کی رقم ادارہ اس کو واپس کر دے، ادارہ کا جرمانہ کی رقم اپنے استعمال میں لانا یا کہیں اور خرچ کرنا اور ملازم کو واپس نہ کرنا جائز نہیں۔

لیکن اگر کوشش کرنے، ضابطہ بنا دینے اور مالی جرمانہ عائد کرنے کے باوجود ملازم اپنی اصلاح نہ کرے، تو جرمانہ کی رقم اس کو واپس کر دے اور اسے برخاست کر دے۔

نیز اگر ملازم سے پہلے ہی اس کی رضامندی سے یہ طے کر لے کہ اصلاح نہ ہونے کی صورت میں جرمانے کی یہ رقم کسی رفاہی کام میں خرچ کی جائے گی، تو اس معاہدہ کے مطابق اس رقم کو کسی رفاہی کام میں خرچ کرنا بھی جائز ہے۔

ملازم کے نماز نہ پڑھنے پر جرمانہ:

فیکٹری، دفاتر اور دیگر محکموں میں کام کرنے والے لوگوں کی دینی معاملات کی نگرانی کرنا ان حضرات کی ذمہ داری ہے، جن کی ماتحتی میں یہ افراد کام کرتے ہوں، چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے:

"ألا كلكم راع و كلكم مسؤل عن رعيته"۔(۱)

ترجمہ: تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور تم میں سے ہر شخص اپنی رعیت کے بارے میں مسئول ہے۔

() مشكوة المصابيح، كتاب الأمارة:(۲/ ۳۲۰)

حدیث شریف میں لفظ راعی استعمال ہوا ہے، جس کے معنی یہ ہے کہ جن معاملات میں حضور اکرم ﷺ نے خیر خواہی کا حکم دیا ہے اور خیانت کرنے سے منع کیا ہے، ان کے اندر تم میں سے ہر شخص نگہبان اور امانت دار ہے، یعنی غفلت، چشم پوشی اور خیانت نہ کرے، لہٰذا یہ حدیث اپنے عموم کے اعتبار سے حاکم، عوام، افراد وماتحت اور امیر وغریب سب کو شامل ہے، پس جس شخص کی ماتحتی میں جو افراد بھی کام کرتے ہوں، اسے چاہئے کہ ان کے معاملات کی نگہبانی کرے، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور دین ودنیا کی خیر خواہی کرے، اگر جان بوجھ کر اس میں کوتاہی کرے گا، تو قیامت کے دن پکڑ کا اندیشہ ہے۔(۱)

احادیث مبارکہ میں نماز نہ پڑھنے پر سخت وعدیں آئی ہیں اور بلا عذر شرعی نماز ترک کرنا سخت ترین گناہ ہے، جس سے بچنا واجب ہے، لہٰذا ذمہ دار حضرات کو چاہئے کہ ماتحت کام کرنے والوں کو نماز کی چھٹی دیں، اور انہیں نرمی سے اچھی طرح نماز باجماعت کی اہمیت بتائیں اور انہیں نماز نہ پڑھنے پر جو وعیدیں احادیث مبارکہ میں آئی ہیں سنائیں، اور اپنے ساتھ لے جاکر نماز پڑھانے کی کوشش کریں، اس کے بعد بھی اگر کوئی نماز نہ پڑھے، تو اس کا گناہ اس پر ہوگا، مالک یا نگران پر کوئی گناہ نہیں اور نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے انہیں نکالنا شرعاً ضروری نہیں۔

نماز نہ پڑھنے پر بطور مالی جرمانہ تنخواہ کاٹنے کے بارے میں یہ تفصیل ہے کہ جتنا وقت نماز پڑھنے کے لئے چھٹی دی جائے گی، اس میں کام کرنے والے اگر مزدور ہے یعنی جتنا مال تیار کریں گے اتنے روپے ملیں گے اس صورت میں بطور جرمانہ تنخواہ کاٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ جتنا مال تیار کریں گے، اسی حساب سے تنخواہ ملے گی۔

اور اگر وہ وقت کے اعتبار سے مزدور ہے، تو انہیں پہلے سے بتا دیا جائے گا کہ نماز کی چھٹی میں اگر نماز نہیں پڑھے گا، تو وقت کے حساب سے اتنی رقم تنخواہ سے کاٹی جائے گی، اس کے بعد بھی اگر کوئی مزدور نماز نہ پڑھے، تو اس وقت کے حساب سے اس کی تنخواہ کاٹنا جائز

---

(۱) مرقاة المفاتیح شرح مشکوة المصابیح :۲/۲۱۱

ہے، یہ مالی جرمانہ میں داخل نہیں ہے۔(۱)

قبل المیعاد ملازمت چھوڑنے پر مالی جرمانہ کا حکم:

بعض کمپنیاں ملازمین رکھتے ہوئے یہ شرط لگاتی ہیں کہ اتنے سال آپ نے کام کرنا ہے، اگر اس وقت سے پہلے آپ نے ملازمت چھوڑ دی، تو اتنی رقم تم کمپنی کو بطور جرمانہ ادا کرو گے، شرعا ایسی شرط رکھنا اجارہ میں یہ عقد کو مفسد کردیتا ہے اور اس شرط کو ختم کرنا لازم ہے، اگر ملازم وقت مقررہ سے پہلے چھوڑ کر چلا گیا، تو اس کو اجرت مثل ملے گا۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: ایک کمپنی اپنے ملازمین کو مقررہ تنخواہ کے علاوہ کچھ رقم دیتی ہے، اس شرط پر کہ پانچ سال یہاں ملازمت کرنا پڑے گی، اگر ملازم میعاد سے قبل چلا گیا تو پانچ سال کی رقم بحساب مقرر دے کر جائے گا، اگر کمپنی نے نکال دیا تو پانچ سال کی رقم پوری کی پوری دے دے گی، چاہے ایک سال کے بعد نکال دے۔ آیا اس قسم کی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟ اور کمپنی والوں کو پیسے ملازم سے لینا اور ملازم کو کمپنی والوں سے لینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا و توجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب: زائد رقم بھی تنخواہ میں داخل ہے اور میعاد سے قبل چھوڑنے کی صورت میں اس کی واپسی کی شرط مفسد اجارہ ہے، لأنه يخالف لمقتضى العقد وفيه نفع لأحد المتعاقدين ۔ لہٰذا جانبین پر توبہ اور اس عقد کا فسخ کرنا فرض ہے، ملازم نے جتنی مدت کام کیا اس کو اس کا اجر مثل ملے گا، جو مقرر تنخواہ مع اضافہ سے زائد نہ ہوگا۔(۲)

---

(۱)فتاوىٰ هنديه:(٤١١/٤)۔مال حرام اور اسکے شرعی مصارف واحکام(٢٩٥)

(٢)احسن الفتاوىٰ:٣١٨/٧

اسی طرح ملازم سے یہ شرط رکھنا کہ اگر قبل المیعاد چھوڑ کر چلا گیا، تو تنخواہ نہیں ملے گی، یہ شرط لگانا بھی جائز نہیں ہے، اس سے بھی اجارہ فاسد ہو جاتا ہے، اس صورت میں ملازم اگر وقت سے پہلے چھوڑ کر چلا جائے، تو جتنے دن کام کیا ہے، ان دنوں کی تنخواہ کا مستحق ہوگا، اجرت مثل اور اجرت مقررہ میں سے جو کم ہوگا ملازم کو وہ ملے گا۔

چنانچہ عالمگیری میں ہے:

”وإن تكاراها إلى بغداد على أنها إن بلغته بغداد فله أجر عشرة دراهم وإلا فلا شيء له، فالإجارة فاسدة، وعليه أجر مثلها بقدر ما سار عليها، كذا في المبسوط“۔(۱)

اور اگر جانور کو کرایہ پر لیا بغداد تک اس شرط پر کہ اگر اس کو بغداد پہنچایا تو اس کو دس درہم اجرت ملے گی، ورنہ کچھ بھی نہیں ملے گا، تو اس صورت میں اجارہ فاسد ہو جائے گا اور اس پر اجرت مثل لازم ہوگی جس مقدار میں اس جانور پر سفر کیا ہے۔

ملازمین کے لئے پینٹ شرٹ کی پابندی:

بہت سارے سرکاری اور نجی اداروں میں ملازمین کے لئے پینٹ شرٹ اور ٹائی لگانے کو لازمی قرار دیا جاتا ہے، پینٹ شرٹ یہ نیک لوگوں کا لباس نہیں ہے اور نہ ہی شریعت کی طرف سے مقرر کردہ لباس کے اصول وشرائط کو پورا کرتا ہے، اس لئے ایک اسلامی ملک میں ایسے لباس سے بچنا چاہئے، ملازمین کے لئے پینٹ شرٹ کو لازمی اور ضروری قرار دینا اور ملازمین سے اس کی پابندی کرانا درست نہیں ہے۔

تعلیمی ادارے، دفاتر اور نجی کمپنیوں کے ذمہ داراں کو چاہئے کہ وہ ایسا ضابطہ ہرگز نہ

(۱) فتاوی عالمگیری: (۴/ ۴۴۳)

بنائیں، جس میں ملازمین خلاف شرع لباس پہننے پر مجبور ہوں، ایسے ملازمین کے لئے حکم شرعی یہ ہے کہ اگر ان کو دوسری جگہ ملازمت ملتی ہے جس میں ایسی پابندی نہ ہو، تو دوسری جگہ ملازمت اختیار کی جائے اور اگر دوسری جگہ ملازمت نہیں ملتی، تو یہ ملازمت بھی کر سکتے ہیں، ایسی مجبوری کی وجہ سے اگر ایسا لباس پہننا پڑے، تو پہنتا رہے اور دل میں اس کو اچھا نہ سمجھے، پینٹ بھی ایسی استعمال کرے جو زیادہ تنگ نہ ہو، بلکہ ڈھیلی ڈھالی ہو، تا کہ اعضاء اچھی طرح چھپے رہیں۔

لیکن یہ دوسری جگہ ملازمت تلاش کرنا صرف پینٹ شرٹ اور ٹائی کی وجہ سے یہ کوئی لازمی اور ضروری نہیں ہے، ان چیزوں کی وجہ سے تنخواہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لئے کہ موجودہ دور میں ملازمت کا ملنا انتہائی دشوار ہے، پینٹ شرٹ کے بارے میں اعتدال والی رائے یہ ہے کہ اس کا چونکہ دنیا بھر میں رواج اور شیوع اتنا زیادہ ہوگیا ہے کہ اب اس میں تشبہ کی شان مغلوب ہوگئی، یعنی اس کے بارے میں جو کہا جاتا تھا کہ یہ کفار کی مشابہت ہے، اب یہ بات نہ رہی، لہٰذا پینٹ شرٹ کا پہننا حرام تو نہیں ہے، البتہ یہ بات ضروری ہے کہ اس کے پہننے سے انگریزوں کے ساتھ مشابہت کچھ نہ کچھ ہو جاتی ہے، نیز یہ صالحین کا لباس بھی نہیں ہے، اس لئے اگر کسی کو ملازمت کی مجبوری کی وجہ سے اس کو پہننا پڑے اور دل میں اس کو اچھا نہ جانے، تو اس کو پہننے کی گنجائش ہے۔

ٹائی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ صلیب کی علامت ہے، اس بارے میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''جہاں تک ٹائی کا تعلق ہے اسکے بارے میں ہمارے طبقہ میں یہ بات مشہور ہے کہ یہ ٹائی درحقیقت صلیب تھی، عیسائی لوگ صلیب لٹکایا کرتے تھے، اب ٹائی کو صلیب کا متبادل بنایا گیا ہے، لیکن مجھے کافی تلاش کے بعد اب تک اس بات کی دلیل اور اس کا کوئی ماخذ نہیں ملا، لباس کے بارے میں جو کتابیں لکھی

گئی ہیں جن میں ہر لباس کی تاریخ لکھی ہوئی ہوتی ہے، اس میں بھی ٹائی کے بارے میں کوئی مضمون اب تک نظر نہیں آیا، اس لئے جب تک اس کی حقیقت معلوم نہ ہو، اس وقت تک اس کو نصاریٰ کا شعار قرار دینے سے میں توکف لسان کرتا ہوں''۔(۱)

ملازمت کے لئے داڑھی منڈانے کی شرط:

اگر کسی محکمے یا ادارے والے ملازمت کے لئے داڑھی منڈانے کی شرط رکھ لیں اور داڑھی منڈوانے کو شرط قرار دیں، تو کیا ایسے محکمے میں ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ داڑھی رکھنا واجب ہے اور اللہ کے نبی ﷺ نے مسلمان کو داڑھی رکھنے کا حکم فرمایا ہے، جب کہ داڑھی منڈانا گناہ کبیرہ ہے، اس لئے اگر کسی محکمے میں یہ شرط ہو، تو اس کے بجائے کہیں اور ملازمت تلاش کی جائے، اللہ تعالیٰ نے رزق حلال کے ذرائع بے شمار رکھے ہیں، اگر کوئی شخص ملازمت کے لئے داڑھی منڈا کر ملازمت اختیار کرلے، تو اگر کام جائز ہو، تو حاصل ہونے والی تنخواہ حلال ہوگی اور داڑھی منڈانے کا گناہ اس کے سر رہے گا۔

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

سوال: میرے ایک دوست داڑھی رکھتے تھے، لیکن ان کی نوکری چلے جانے کا ڈر تھا، اس لئے داڑھی نکال لی، اس کا کیا حکم ہے۔

جواب: داڑھی رکھنا واجب ہے اور داڑھی منڈانا گناہ ہے، قانونی اعتبار سے داڑھی ملازمت میں مانع نہیں، اس لئے آپ کے دوست کو استقامت اختیار کرنی چاہئے تھی، اس میں اللہ کی مدد شامل ہوتی اور ضرور ان کا یہ مسئلہ حل ہوجاتا، اصل روزی دینے والی ذات اللہ تعالیٰ ہے۔(۲)

---

(۱) تقریر ترمذی:۲/۳۳۲

(۲) کتاب الفتاوی:۶/۱۴۶) زمزم کراچی

ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ کا حکم:

ہمارے ملک میں مختلف مواقع پر ہڑتالیں کثرت کے ساتھ ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے مختلف کمپنیوں اور محکموں کو اچھا خاصا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے، کئی کئی دنوں تک فیکٹریاں کارخانے یا دکانیں بند ہوتی ہیں، کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے، تو کیا ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ بھی ملازمین کو ملے گی یا نہیں؟ چونکہ ہڑتال کے دنوں میں ملازمین فارغ ہوتے ہیں اور کام پہ نہیں جاتے، اس لئے ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ کا مطالبہ کرنا شرعاً ملازمین کے لئے جائز نہیں ہے۔

بعض کمپنیوں یا فیکٹریوں والے اپنے ملازمین سے معاہدہ کرتے ہیں کہ اگر مہینے میں مثلاً دس دن ہڑتال رہی، تو ملازمین کو پانچ دن کی تنخواہ ملے گی، شرعاً ایسا معاہدہ کرنا جائز ہے، اگر مالک اپنی مرضی سے تنخواہ دے، تو جائز ہے، لیکن ملازمین کے لئے مطالبہ کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ وہ حق دار ہی نہیں ہیں۔ چنانچہ شامیہ میں ہے:

"فلو سلم بنفسه، ولم يتمكن منه لعذر، كمطر ونحوه، لا أجر له كما في المعراج عن الذخيرة"۔ (۱)

ملازم کا اپنی ملازمت کسی دوسرے پر فروخت کرنا:

بہت سارے لوگ اپنی ملازمت کو دوسرے پر بیچ کر خود اس ملازمت سے دست بردار ہو جاتے ہیں، مثلاً کوئی شخص کسی جگہ چوکیدار ہے اور اس کی ماہانہ تنخواہ مقرر ہے، اب وہ کسی دوسرے شخص سے پچاس ہزار روپے لے کر چوکیداری اس کے حوالے کر دیتا ہے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ چوکیداری یا اس جیسی ملازمتوں کو بیچنا ناجائز ہے، البتہ متاخرین فقہاء کرام نے کسی ملازمت سے دستبردار ہونے اور اس کا عوض لینے کو اس ملازمت میں جائز

(۱) رد المحتار: (۶/۶۹)

قرار دیا ہے، جو ملازمت دستبردار ہونے والے کے لئے اصالۃً ثابت ہو، دفع ضرر کے لئے نہ ہو، جیسے حق شفعہ وحق قسم وغیرہ، نیز اس شخص کو اپنی اس ملازمت پر فائز رہنے کے لئے قانونی پشت پناہی بھی حاصل ہو اور کسی شخص کو اسے اس ملازمت یا نوکری سے ہٹانے کا اختیار حاصل نہ ہو، سوائے اس کے کہ اس سے کوئی ایسی قانونی غلطی سرزد ہو جائے جس کی وجہ سے قانوناً اسے معزول کرنا ضروری ہو، اگر مذکورہ بالا شرائط نہ پائی جائیں، جیسا کہ آج کل کی عام ملازمتوں کا حال ہے اور چوکیداری کی ملازمت بھی اسی قسم کی ہے کہ چوکیدار کو کسی بھی وقت چوکیداری سے معزول کیا جاسکتا ہے اور چوکیدار کو دائمی طور پر اس ملازمت پر باقی رہنے کا حق حاصل نہیں ہوتا، پس ایسی ملازمتوں سے دستبردار ہونے کے بدلے عوض لینا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔ درمختار میں ہے:

"وفي الاشباه: لايجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة كحق الشفعة وعلىٰ هذا لايجوز الاعتياض عن الوظائف بالأوقاف"۔(۱)

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

سوال: ایک مسئلہ جو آج کل لوگوں میں عام ہے کہ اکثر بازاروں کی چوکیداری ایک دوسرے پر قیمتاً فروخت کرنا ہے، چونکہ اس پر پہلے والے چوکیدار نے قیمت ادا نہیں کی ہوتی، اور نہ ہی کوئی محنت ومشقت کی ہوتی ہے، تو اس نوکری پر روپے لینا حرام ہے یا حلال؟ یا کوئی ایسی کمپنی کا کارڈ ہو کہ اس میں عام آدمی بھرتی نہیں ہوسکتے، جیسا کہ آج کل کیماڑی کے پورٹ اور پورٹ قاسم میں مزدوروں کو حکومت نے پکے کارڈ دیئے ہیں اور عام آدمی پکے مزدوروں میں بھرتی نہیں ہوسکتے۔ اور وہ مزدور اپنا کارڈ تقریباً ایک لاکھ پر فروخت کرتے

(۱) الدر المختار: (٤/٥١٨)

ہیں اور لوگ بہت خوشی سے خرید لیتے ہیں، تو یہ کارڈ فروخت کرنا یا خریدنا حرام ہے، یا حلال؟

جواب: مذکورہ حقوق کی خرید وفروخت صحیح نہیں، اس سے حاصل شدہ مال حرام ہے۔(۱)

مالک کی اجازت کے بغیر فیکٹری کی چیزیں کھانا:

اگر کوئی شخص کسی ایسی فیکٹری میں ملازم ہو، جہاں کھانے پینے کی چیزیں بنتی ہوں، مثلاً مختلف کوک، پیپسی وغیرہ کی فیکٹریاں، یا بسکٹ، بند وغیرہ کی فیکٹری، یا اس کے علاوہ کوئی بھی ایسی فیکٹری ہے جس میں کھانے پینے کی چیزیں بنتی ہوں، تو اگر مالک کو معلوم ہے کہ ملازمین اس میں سے کھاتے ہیں اور ان کو منع نہیں کرتا، تو یہ خاموش رہنا اس کی طرف سے اجازت ہے، اس صورت میں ملازمین کھا سکتے ہیں، لیکن اگر مالک سے چھپ کر کھاتے ہیں، یا مالک نے صراحۃً منع کر دیا ہے، تو اس صورت میں بسکٹ وغیرہ کھانا اور پینا جائز نہیں ہے، احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ بغیر اجازت کے کوئی بھی چیز نہ کھائی جائے۔ فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

سوال: [۸۹۱۱] میں ایک بسکٹ کمپنی میں کام کرتا ہوں، اس میں کام کرنے والے سبھی ملازم بغیر اجازت مالک و منیجر بسکٹ کھاتے ہیں اور مالک و منیجر کو بھی اس کا علم ہے، مالک غیر مسلم ہے، کیا کھانا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر کام کرنے والوں کی سرکشی کی وجہ سے مالک معلوم ہونے کے باوجود کوئی روک ٹوک نہیں کرتا، مگر نہ وہ رضامند ہے، نہ اس نے اجازت دی ہے، تو اس طرح کھانا جائز نہیں ہے۔(۲)

---

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: (۶/۵۴)

(۲) فتاویٰ محمودیہ: (۱۸/۴۲۰)

باب......(۷)

ملازمت کی جائز اور ناجائز صورتیں

کسی بھی ادارے یا محکمے میں ملازمت کے جائز ہونے کا مدار دو باتوں پر ہے:

۱)......وہاں کام کی نوعیت کیا ہے؟ یعنی ملازم کے حصے میں جو کام ہے، وہ کام شرعی نقطہ نگاہ سے جائز ہے، یا نہیں؟ اگر وہ کام شرعی نقطہ نگاہ سے جائز ہے، تو ایسی ملازمت بھی جائز ہے، اور اگر ملازمت کسی ناجائز کام کی ہے، مثلاً سود کے حساب کتاب کا کام کرنا، چونکہ یہ کام بذات خود حرام ہے، اس لئے ایسی نوکری کرنا بھی ناجائز اور حرام ہوگی اور ملنے والی تنخواہ بھی لازماً حرام ہوگی، حتیٰ کہ اگر ملازم کو مالک حلال مال سے تنخواہ دے، تب بھی وہ حرام ہی ہوگی، اس لئے کہ حرام کام کی تنخواہ بھی حرام ہے۔

۲)......دوسری بات یہ ہے کہ جائز خدمت کے عوض ملازم کو جو تنخواہ دی جاتی ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ تنخواہ بھی حلال مال سے دی جائے، اس لئے کہ جائز کام پر بھی تنخواہ مال حرام سے لینا جائز نہیں ہے، لہٰذا جو ادارہ محکمہ یا شخص اپنے ملازم کو حرام مال سے تنخواہ دیتا ہو، اس کے ہاں بھی ملازمت یا نوکری جائز نہیں ہے۔

ناجائز ملازمت کا اصول:

جن ملازمتوں میں خلاف شرع حکم کرنے پر گورنمنٹ کی طرف سے ملازم مجبور ہوتا ہے، وہ ملازمین اور ان کی آمدنی سب ناجائز ہیں۔ (۲)

(۲) فتاویٰ محمودیہ: (۱۶/۵۷۰)

یہاں ایک سوال ہوتا ہے کہ پاکستان کے کس محکمے میں ملازمت جائز ہے اور کس میں ناجائز ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ تمام محکمے اور ادارے جن کا کاروبار ناجائز ہے یا سودی ہے، جیسا کہ بینک، انشورنس کارپوریشن وغیرہ ان محکموں میں ملازمت کرنا جائز نہیں ہے اور جو محکمے جائز اور غیر سودی کاروبار کرتے ہیں، جیسا کہ ڈاک کا محکمہ، یا محکمہ تعلیم وغیرہ ان میں ملازمت کرنا جائز ہے۔

انکم ٹیکس کے ادارے میں ملازمت کا حکم:

موجودہ زمانے میں انکم ٹیکس کے اداروں میں ملازمت کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ ٹیکسوں کی تشخیص کا جو طریقہ ہمارے ہاں رائج ہے، یہ صریح ظلم ہے، جب کہ ان ٹیکسوں کے مصارف بھی صحیح نہیں، اس لئے انکم ٹیکس اداروں میں ملازمت جائز نہیں ہے، حضور ﷺ کا ارشاد ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

"إن صاحب المكس في النار"۔(۱)

''ترجمہ: بے شک ٹیکس وصول کرنے والا جہنم میں ہوگا''۔

جبکہ مسند احمد میں یہ الفاظ منقول ہیں:

"لایدخل الجنة صاحب مكس یعني المشار"۔(۲)

جو ٹیکس ہمارے ہاں رائج ہے اور جو حکومت والے عائد کرتے ہیں، اس ٹیکس کا مسلمانوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، یہ حکومت کی طرف سے عوام پر ناجائز بوجھ ہے، جو اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے، اس لے ایسی ملازمت سے بچنا ایک سچے مسلمان کے لئے ضروری ہے۔

---

(۱) لسان العرب: (۶/۲۲۰)

(۲) مسند احمد بن حنبل: (۴/۱۰۹)

مفتی رشید احمد لدھیانویؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''یہ سب ٹیکس ناجائز ہیں اور ان محکموں میں ملازمت بھی ناجائز ہے''۔(۱)

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

سوال: [۸۴۴۶] ایک شخص چنگی چوکی کا داروغہ ہے، اس کی نظر سے فضائل صدقات، ص: ۲۷ پر ایک حدیث گزری کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''جس شخص کے پاس کوئی عذر کرے اور وہ قبول نہ کرے تو اس کو اتنا گناہ ہوتا ہے جتنا کہ چنگی وصول کرنے والوں کو''۔ اب داروغہ بہت پریشان ہے کہ چنگی کی ملازمت کرے یا نہ کرے۔

الجواب حامداً ومصلیا: شریعت نے ٹیکس کو حرام قرار دیا ہے اور ٹیکس وصول کرنے والے کے لئے سخت وعید ہے، اس کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی، آج کل چنگی کا حال بھی تقریباً ایسا ہی ہے، اس لئے جب دوسری ملازمت کو پالے، یا گزارہ کی صورت ہو جائے، تو چنگی کی ملازمت نہ کرے، اگر ملازمت کر لی ہے اور دوسری جائز ملازمت اس سے بہتر موجود ہے، تو چنگی کی ملازمت ترک کر دی جائے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (۲)

بیمہ کمپنی کی ملازمت کا شرعی حکم:

آج کل جتنی بھی بیمہ کمپنیاں ہیں، تقریباً تمام سودی کاروبار میں ملوث ہیں، اس لئے کسی بھی بیمہ کمپنی میں ملازمت کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اور ملنے والی تنخواہ بھی حرام ہوگی، اس لئے ایسی ملازمت سے بچنا ضروری ہے۔

---

(۱) احسن الفتاویٰ: (۸/۹۹)

(۲) فتاویٰ محمودیہ: (۱۷/۱۲۰)

احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: بنک، بیمہ کمپنی اور محکمہ انکم ٹیکس جس میں سینما، موٹروں اور مکانوں پر ٹیکس کی تشخیص وتحصیل کا کام ہوتا ہے، اسی طرح کسٹم آبکاری جس میں نشہ آور چیزوں کی درآمد پر ٹیکس وصول کیا جاتا ہے، ان محکموں میں ملازمت جائز ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا

الجواب: بنک اور بیمہ ربا ہے اور ٹیکسوں کی تشخیص کا طریق مروج ظلم ہے، ان کے مصارف بھی صحیح نہیں، اس لئے ان میں ملازمت جائز نہیں۔(۱)

مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب لکھتے ہیں:

''بنک اور انشورنس کی بحثوں کے مطالعے کے بعد اس میں شک نہیں رہ جاتا کہ یہ دونوں ادارے شرعاً ممنوع کام یعنی سودی کاروبار کرتے ہیں، اس میں ملازمت کرنا سودی کاروبار میں تعاون دینا ہوا، جو بہر صورت شرعاً ممنوع ہے، لہٰذا ان اداروں کی ملازمت بھی ممنوع ہے''۔(۲)

مولانا یوسف لدھیانوی صاحب ؒ لکھتے ہیں:

''بیمہ کی جو موجودہ صورتیں رائج ہیں، وہ شرعی نقطہ نظر سے صحیح نہیں، بلکہ قمار اور جوا کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں، اس لئے اپنے اختیار سے تو بیمہ کرانا جائز نہیں، اور اگر قانونی مجبوری کی وجہ سے بیمہ کرانا پڑے، تو اپنی ادا کردہ رقم سے زیادہ وصول کرنا درست نہیں، چونکہ بیمہ کا کاروبار درست نہیں، اس لئے بیمہ کمپنی میں ملازمت بھی صحیح نہیں۔''(۳)

---

(۱)احسن الفتاویٰ :۸/۹۰

(۲)موجودہ زمانے کے مسائل کا شرعی حل:(ص:۱٦۲)

(۳)آپ کے مسائل اور انکا حل:٦/۲۵۵۔ھکذا فی فتاویٰ عثمانی:۳/۴۰۹

بیمہ کمپنی کے ملازم کو گھر کرایہ پر دینا:

اگر کوئی شخص بیمہ کمپنی میں ملازم ہو، تو ایسے ملازم کو رہنے کے لئے گھر کرایہ پر دینا جائز نہیں، کیونکہ جب اس کی اصل تنخواہ حرام ہے، تو یقیناً اس گھر کا کرایہ بھی اسی حرام تنخواہ ہی سے دے گا اور کرایہ میں مال حرام کا وصول کرنا جائز نہیں ہے۔

احسن الفتاویٰ میں ایک سوال کے جواب میں مفتی رشید احمد صاحب ؒ لکھتے ہیں:

''یہ رقم حرام ہے، اس کو کسی صورت میں استعمال کرنا جائز نہیں، مساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے''۔(۱)

کیا تکافل کمپنی میں ملازمت جائز ہے؟

آج کل ہمارے ملک پاکستان سمیت بہت سارے اسلامی ممالک میں انشورنس یا بیمہ کا شرعی متبادل ''تکافل'' کے نام سے بے شمار کمپنیاں کام کر رہی ہیں، چونکہ یہ کمپنیاں کسی غیر شرعی کام میں ملوث نہیں ہوتیں، مجموعی اعتبار سے ان کا اصل کام سود یا جوا نہیں ہے، اسلئے ان تکافل کمپنیوں میں ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے اور حاصل ہونے والی تنخواہ بھی حلال ہے۔

بینک کی ملازمت:

جس طرح سود کا کھانا اور استعمال کرنا گناہ کبیرہ ہے، ایسا ہی سود کے کاموں میں تعاون کرنا بھی گناہ کبیرہ ہے، حضور ﷺ کا ارشاد سود کے بارے میں صراحۃً موجود ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

''لعن رسول الله ﷺ آكل الربوا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال هم سواء''۔(۲)

---

(۲) مسلم: ۲/۲۷۔ باب الرباء

(۱) احسن الفتاوی: ۳۰۴/۷

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، اور اس کے لکھنے والے، اور اس کے گواہ بننے والوں پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا کہ یہ سب گناہ میں برابر ہیں۔

چونکہ بینک کا سارا کاروبار سود پر ہی چلتا ہے، بینک میں کام کرنے والے ملازمین یا تو سود کو لکھتے ہیں، یا سود کے گواہ بنتے ہیں، اور اگر ایسی صورت نہ بھی ہو، تب بھی ان کو تنخواہ اسی سود کی رقم سے ملتی ہے، اس لئے علماء کی تصریحات کے مطابق دور حاضر کے کنوینشل بینکوں میں ملازمت یا نوکری کرنا جائز نہیں ہے، اور حاصل ہونے والی تنخواہ محض حرام ہے۔

حضرت مولانا یوسف لدھیانویؒ لکھتے ہیں:

''بینک کا نظام جب تک سود پر چلتا ہے، اس کی نوکری حرام ہے، ان حضرات کا یہ استدلال کہ ''ہم تو نوکر ہیں، خود تو سود نہیں لیتے'' جواز کی دلیل نہیں ہے، کیونکہ حدیث میں ''رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے پر، کھلانے والے پر اور اس کے لکھنے والے پر اور اس کی گواہی دینے والے پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا کہ یہ سب برابر ہیں'' پس جب آنحضرت ﷺ نے ان سب کو ملعون اور گناہ میں برابر قرار دیا ہے، تو کسی شخص کا یہ کہنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے کہ ''میں خود تو سود نہیں لیتا، میں تو سودی ادارے میں نوکری کرتا ہوں''۔ علاوہ ازیں بنک ملازمین کو جو تنخواہیں دی جاتی ہیں، وہ سود میں سے دی جاتی ہیں، تو مال حرام میں سے تنخواہ لینا کیسے حلال ہوگا؟ اگر کسی نے بدکاری کا اڈاہ قائم کیا ہو، اور اس نے چند ملازمین بھی اپنے اس ادارے میں کام کرنے کے لئے رکھے ہوں، جن کو اس گندی آمدنی میں سے تنخواہ دیتا ہو، کیا ان ملازمین کی یہ نوکری حلال اور ان کی تنخواہ پاک ہوگی؟

جو لوگ بنک میں ملازم ہیں، ان کو چاہئے کہ جب تک بنک میں سودی نظام نافذ ہے اپنے پیشہ کو گناہ اور اپنی تنخواہ کو ناپاک سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہیں اور کسی جائز ذریعہ معاش کی تلاش میں رہیں، جب جائز ذریعہ معاش مل جائے، تو فوراً بنک کی نوکری چھوڑ کر اس کو اختیار کر لیں۔(۱)

اس لئے دور حاضر کے تمام بینکوں میں (سوائے اسلامی بینکوں کے) ملازمت کرنا شرعا ناجائز ہے اور ملنے والی تنخواہ بھی حرام ہے اور ایسی تنخواہ واجب التصدق ہے، البتہ جو لوگ بینک کی ملازمت کر رہے ہیں، وہ لوگ دوسرا جائز ذریعہ معاش نہ ملنے تک بنک ملازمت کو نہ چھوڑیں اور جائز ذریعہ معاش کی تلاش میں لگے رہیں، جیسے ہی کوئی دوسری حلال نوکری یا ملازمت مل جائے، خواہ کم آمدنی کی ملازمت ہی کیوں نہ ہو، بنک کی ملازمت چھوڑ دے۔

بنک کی ملازمت کا حکم:

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

سوال: بینک کی ملازمت کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟

(۲) اگر ملازمت اختیار کر چکا ہے، تو قائم رکھے یا نہیں؟

جواب: بینک کا بیشتر کاروبار چونکہ سود پر مبنی ہے، اس لئے اس کی ملازمت جائز نہیں ہے۔

(۲) دوسری جائز ملازمت حاصل کرنے کیلئے پوری کوشش کرے، جب تک نہ ملے دعا و توبہ و استغفار کرتا رہے، اور ملتے ہی یہ ملازمت چھوڑ دے، پھر جب اللہ توفیق دے تو بنک سے کمائی ہوئی رقم رفتہ رفتہ صدقہ کر دے۔(۲)

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۲۵۰/۶

(۲) فتاویٰ عثمانی: ۳۹۶/۳

بینک کی ملازمت کیوں حرام ہے

مفتی صاحب دامت برکاتہم العالی تقریر ترمذی میں فرماتے ہیں:

''بینک کی ملازمت ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بینک کے اندر سودی لین دین ہوتا ہے، اور جو شخص بھی بینک میں ملازم ہے وہ کسی نہ کسی درجے میں سودی لین دین میں تعاون کر رہا ہے، اور کسی بھی گناہ کے کام میں تعاون کرنا قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق حرام ہے۔ فرمایا:

﴿ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾(۱)

اس وجہ سے بینک کی ملازمت حرام ہے۔(۲)

فتاویٰ بینات میں ہے:

''بینک میں ملازمت اختیار کرنا جائز نہیں ہے، اسی طریقے سے بینک کی تنخواہ لینا جائز نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بینک میں سودی کاروبار ہوتا ہے، اور بینک میں ملازم ہونا سودی کاروبار میں معاون بننا ہے اور اس سے تنخواہ لینا سود سے تنخواہ لینا ہے''۔(۳)

اگر بینک ایسا ہو کہ اس میں سودی معاملات نہ ہوتے ہوں، جیسے آج کل بہت سارے بینک ایسے ہیں، جو اسلامی اصولوں پر بینکنگ کا کاروبار کرتے ہیں، تو ایسے بینک میں ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے۔

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''جب بنک میں سودی کاروبار نہیں ہوگا، تو اس کی ملازمت بلاشک وشبہ جائز

(۱) المائدۃ، آیت:۲

(۲) تقریر ترمذی: ۱/ ۴۰

(۳) فتاویٰ بینات: ۴/ ۷۲۔ ط مکتبہ بینات

ہوگی‘‘۔(۱)

اس لئے ہمارے ہاں علماء کی نگرانی میں جو اسلامی بینک چل رہے ہیں، ان میں معاملات کرنا اور ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے۔

زرعی ترقیاتی بنک میں ملازمت کا حکم

زرعی ترقیاتی بنک میں نوکری کرنا بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ بھی ایک سودی بنک ہے۔

آپ کے مسائل اور انکا حل میں ہے:

سوال: کیا میں زرعی ترقیاتی بنک میں نوکری کرسکتا ہوں؟

جواب: زرعی ترقیاتی بنک اور دوسرے بنک کے درمیان کوئی فرق نہیں۔(۲)

بنک کے سود کو منافع قرار دینے کے دلائل کے جوابات:

سوال: میں ایک بنک میں ملازم ہوں۔ تمام عالموں کی طرح آپ کا یہ خیال ہے کہ بنک میں جمع شدہ رقم پر منافع سود ہے اور اسلام میں سود حرام ہے، سود میرے نزدیک بھی حرام ہے، لیکن سود کے بارے میں میں اپنی رائے تحریر کررہا ہوں، معاف کیجئے گا کہ میری رائے غلط بھی ہوسکتی ہے، آپ کی رائے میرے لئے مقدم ہوگی۔ میرے نزدیک سود وہ ہے جو کسی ضرورت مند شخص کو دے کر اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی دی ہوئی رقم سے زائد رقم لوٹانے کا وعدہ لیا جائے اور وہ ضرورت کے تحت رقم دینے پر مجبور ہو۔ کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر زیادہ رقم وصول کرنا میرے نزدیک سود ہے، اور اس کو

(۱) آپ کے مسائل اور انکا حل: ۲۴۹/۶

(۲) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۲۴۹/۶

ہمارے مذہب میں سود قرار دیا گیا ہے، میرے پاس اپنے اخراجات کے علاوہ کچھ رقم پس انداز تھی جس کو میں اپنے جاننے والے ضرورت مند کو دے دیا کرتا تھا، لیکن ایک دو صاحبان نے میری رقم واپس نہیں کی، جبکہ میں ان سے اپنی رقم سے زیادہ وصول نہیں کرتا تھا اور نہ ہی واپسی کی کوئی مدت مقرر ہوئی تھی، جب ان کے پاس ہو جاتے تھے وہ مجھے اصل رقم لوٹا دیا کرتے تھے، لیکن چند صاحبان کی غلط حرکت نے مجھے رقم کسی کو بھی نہ دینے پر مجبور کر دیا۔

میرے پاس جو رقم گھر میں موجود تھی اس کے چوری ہو جانے کا بھی خوف تھا اور دوسرے یہ کہ اگر اسی رقم سے میں کچھ آسائش کی اشیاء خریدتا ہوں تو میرے اخراجات میں اضافہ ہو جائے گا جب کہ تنخواہ اس کا بوجھ نہیں برداشت کر سکتی۔ اس لئے میں نے بہتر یہی سمجھا کہ کیوں نہ اس کو بنک میں ڈپازٹ کر دیا جائے، لیکن سود کا لفظ میرے ذہن میں تھا۔ پھر میں نے کافی سوچا اور بالآخر یہ سوچتے ہوئے بنک میں جمع کروا دیا کہ اس رقم سے ملکی معیشت میں اضافہ ہوگا جس سے غریب عوام خوش ہوں گے اور دوسرے میری معاشی مشکلات میں کمی ہو جائے گی۔ میں بنک کے منافع کو سود اس لئے بھی نہیں سمجھتا کہ اس طرح کسی کی مجبوریوں سے فائدہ نہیں اٹھا رہا، کسی کو نقصان نہیں پہنچا رہا اور پھر بنک میں جمع شدہ رقم سے ملکی معیشت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے، اس طرح سے بیروزگار افراد کو روزگار ملتا ہے اور پھر یہ کہ بنک اپنے منافع میں سے کچھ منافع ہمیں بھی دیتا ہے۔ میرے نزدیک یہ منافع سود اس لئے نہیں کہ اس طرح سے کسی کی ضروریات سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا، کیونکہ بعض دفعہ کسی کو ادھار دی ہوئی رقم بڑھتے بڑھتے اتنی ہو جاتی ہے کہ اصل رقم لوٹانے کے

باوجود بھی اصل رقم سے زائد قرضہ رہ جاتی ہے۔ میرے نزدیک صرف اور صرف یہ سود ہے، بنک کا منافع سود نہیں۔

دوسری بات میری بنک ملازمت ہے۔ بنک ملازمت کو آپ عالم حضرات ناجائز کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں جو روزی کمار ہا ہوں، وہ بھی ناجائز ہے، تو کیا میں ملازمت چھوڑ دوں اور ماں باپ اور بچوں کو اور خود کو بھوکا رکھوں؟ (غالباً جو لوگ بنک ملازمت نہیں کرتے شائد وہ سارے بھوکے رہتے ہیں۔ از مرتب) کیونکہ ملازمت حاصل کرنا بہت مشکل کام ہے اور پھر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر گورنمنٹ ملازم کو جو تنخواہ ملتی ہے، اس میں بنک کے منافع کا حصہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اس طرح سے تو ہر گورنمنٹ ملازم ناجائز روزی کمار ہا ہے اور آپ یہ کہیں کہ وہ شخص محنت کر کے روزی کمار ہا ہے تو ہمیں بھی بنک بغیر محنت کے تنخواہ نہیں دیتا۔ ہم جو تنخواہ بنک سے لیتے ہیں وہ ہماری محنت کی ہوتی ہے، نہ کہ بنک اپنے منافع سے دیتا ہے، اور آپ روزی کے اس ذریعہ کو کیا کہیں گے جو کوئی کسی بنک ملازم کے ہاں، رشوت خور، منشیات فروش، مشرک، طوائف اور ڈاکو کے ہاں کام کر کے روزی کماتا ہے؟ ان مندرجہ بالا باتوں سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو کہیں پر بھی کوئی بھی ملازمت کرتا ہے اس کی تنخواہ میں ناجائز پیسہ ضرور شامل ہو جاتا ہے، لہٰذا میرے ان سوالوں کا تفصیلی جواب عنائت فرمائیں۔

جواب: روپیہ قرض دے کر اس پر زائد روپیہ وصول کرنا سود ہے، خواہ لینے والا مجبوری کی بناء پر قرض لے رہا ہو، یا اپنا کاروبار چمکانے کے لئے اور وہ جو زائد روپیہ دیتا ہے، خواہ مجبوری کے تحت دیتا ہو یا خوشی سے، اس لئے آپ کا یہ

خیال صحیح نہیں ہے کہ سود محض مجبوری کی صورت میں ہوتا ہے۔

(۱) یہ بنک کا سود جو آپ کو بے ضرر نظر آ رہا ہے، اس کے نتائج آج عفریت کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ امیروں کا امیر تر ہونا اور غریبوں کا غریب تر ہونا، ملک میں طبقاتی کشمکش کا پیدا ہو جانا اور ملک کا کھربوں روپے کا بیرونی قرضوں کے سود میں جکڑ اجانا سودی نظام کے شاخسانے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سودی نظام کو اللہ ورسول ﷺ کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا ہے۔ اسلامی معاشرہ خدا اور رسول سے جنگ کر کے جس طرح چور چور ہو چکا ہے، وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ میرے علم میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ کچھ لوگوں نے بنک سے سودی قرضہ لیا اور پھر اس لعنت میں ایسے جکڑے گئے کہ نہ جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں۔ ہمارے معاشی ماہرین کا فرض یہ تھا کہ وہ بینکاری نظام کی تشکیل غیر سودی خطوط پر استوار کرتے، لیکن افسوس کہ آج تک سود کی شکلیں بدل کر ان کو حلال اور جائز کہنے کے سواء کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

(۲) بنک کے ملازمین کو سودی کام (حساب وکتاب) بھی کرنا پڑتا ہے، اور سود ہی سے ان کو تنخواہ بھی ملتی ہے، جبکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

”عن علی أنه سمع رسول الله ﷺ: لعن آكل الربا أو موكله وكاتبه“۔(۱)

”اللہ کی لعنت: سود لینے والے پر، دینے والے پر، اس کی گواہی دینے والے پر اور اس کے لکھنے والے پر“۔ جو کام بذات خود حرام ہو، ملعون ہو اور اس کی اجرت بھی حرام مال ہی سے ملتی ہو، اس کو اگر ناجائز نہ کہا جائے، تو کیا کہا

(۱) مشکوۃ ص ۲٤٦

جائے؟ فرض کریں کہ ایک شخص نے زنا کا اڈہ قائم کر رکھا ہے اور زنا کی آمدنی سے وہ قحبہ خانہ کے ملازمین کو تنخواہ دیتا ہے، تو کیا اس تنخواہ کو حلال کہا جائے گا؟ اور کیا قحبہ خانہ کی ملازمت حلال ہوگی؟

آپ کا یہ شبہ کہ تمام سرکاری ملازمین کو جو تنخواہ ملتی ہے، اس میں بنک کا منافع شامل ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی ملازمت بھی صحیح نہیں ہوئی۔ یہ شبہ اس لئے صحیح نہیں کہ دوسرے سرکاری ملازمین کو سود کی لکھت پڑھت کے لئے ملازم نہیں رکھا جاتا، بلکہ حلال اور جائز کاموں کے لئے ملازم رکھا جاتا ہے، اس لئے ان کی ملازمت جائز ہے۔ اور گورنمنٹ جو تنخواہ ان کو دیتی ہے، وہ سود میں سے نہیں دیتی، بلکہ سرکاری خزانے میں جو رقوم جمع ہوتی ہیں، ان میں سے دیتی ہے اور بنک ملازمین کو ان پر قیاس کرنا غلط ہے۔

آپ کا یہ کہنا کہ ملازمت چھوڑ کر والدین کو اور خود کو اور بچوں کو بھوکا رکھوں؟ اس کے بارے میں یہی عرض کر سکتا ہوں کہ جب قیامت کے دن آپ سے سوال کیا جائے گا کہ ''جب ہم نے حلال روزی کے ہزاروں وسائل پیدا کئے تھے، تم نے کیوں حرام کمایا اور کھلایا؟'' تو اس سوال کا کیا جواب دیجئے گا؟ اور میں کہتا ہوں کہ اگر آپ بھوک کے خوف سے بنک کی ملازمت پر مجبور ہیں اور ملازمت نہیں چھوڑ سکتے تو کم سے کم اپنے گناہ کا اقرار تو اللہ کی بارگاہ میں کر سکتے ہیں کہ ''یا اللہ! میں اپنی ایمانی کمزوری کی وجہ سے حرام کما اور کھلا رہا ہوں، میں مجرم ہوں مجھے معاف فرما دیجئے'' اقرار جرم کرنے میں تو کسی بھوک، پیاس کا اندیشہ نہیں۔ (۱)

ایک شبہ اور اس کا جواب:

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ صرف بینک کی ملازمت کو ہی کیوں حرام قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ وہ تمام نوکریاں حرام ہوتی چاہئے، جو حکومت کی طرف سے ملتی ہیں، کیونکہ حکومت خود ورلڈ بینک سے قرض حاصل کرتی ہے اور گورنمنٹ کے ہر ملازم کو گویا سود سے اس کی ماہانہ تنخواہ دی جاتی ہے

جواب: یہ شبہ اس لئے درست نہیں کہ اول تو گورنمنٹ کی ساری آمدنی ورلڈ بینک کے قرض سے ہی نہیں ہوتی؛ بلکہ اس آمدنی کا غالب حصہ اندرون ملک کے وسائل سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں قدرتی صنعتیں، عوام سے لیا جانے والا ٹیکس، ریلوے، ہوائی جہاز، پوسٹ، اوقاف، روڈ وغیرہ سے حاصل ہونے والی آمدنی اور اس کے علاوہ آمدن کے بہت سے ذرائع ہیں۔

دوسری بات حکومت ورلڈ بینک سے سود لیتی نہیں، بلکہ ورلڈ بینک کو سود دیتی ہے، اور سودی قرض حاصل کرتی ہے، جبکہ بینک میں ایسا نہیں ہوتا، بلکہ بینک لوگوں سے سود حاصل کرتا ہے اور اسی سود کے پیسہ سے ملازمین کی تنخواہ دی جاتی ہے، سود دینے کی صورت میں حکومت کو گناہ تو ہوتا ہے، لیکن جو قرض لیا ہے، وہ رقم حلال ہے، جبکہ بینک خود سود لیتا ہے، سود لینے کا الگ گناہ اور حاصل ہونے والا پیسہ بھی حرام ہے،، تو بینک کی ملازمت اس لئے ناجائز ہے کہ اکثر اوقات یہ سودی لین دین میں تعاون ہوتا ہے اور سودی معاملات میں تعاون بھی جائز نہیں ہے، جب گورنمنٹ کے دوسرے محکموں میں ملازمت کرنے والوں کا سود لینے اور دینے والوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس لئے سرکاری ملازمتیں جن میں براہ راست کسی حرام کا ارتکاب نہ ہوتا ہو، جائز ہیں، اس لئے یہ خیال غلط ہے کہ گورنمنٹ کی ہر ملازمت ناجائز ہے۔(۱)

---

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ٦/ ٢٤٥

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

''سوال: ہمارے ایک دوست ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ آج کل کی تنخواہ جو بھی ملازم لیتا ہے حرام ہے، کیونکہ حکومت کا تمام کاروبار سودی ہے، اور سودی رقم سے ہمیں تنخواہ ملتی ہے، اس کے متعلق کیا رائے ہے؟

جواب: آپ کے دوست کا خیال درست نہیں، حکومت کی ساری آمدنی سودی نہیں ہے، بلکہ بہت سے ذرائع آمدنی جائز ہیں اور ایسی صورت میں اس سے تنخواہ وصول کرنا شرعاً جائز اور درست ہے''۔(۱)

بینک کے کون کون سے شعبوں کی آمدنی جائز ہے؟

جن شعبوں میں سود کا کام کرنا پڑتا ہو ان تمام شعبوں کی آمدز   سود کا لین دین یا لکھنا یا گواہی دینا یا اس کے معاملہ میں کسی طرح کی معاونت کرنا یہ   ہے۔

باقی ایسے معاملات جن کا سود سے کوئی تعلق نہیں ہے، جیسے ایک آدمی کیشئر ہے اور کوئی آدمی چیک لاتا ہے اور اس کو چیک دیتا ہے، یا ڈرائیور ہے، یا چپڑاسی ہے، اس حد تک گنجائش ہے۔(۲)

بینک ملازم رشتہ دار کے گھر کھانا کھانا اور اس کا تحفہ قبول کرنا:

اگر کسی کا کوئی رشتہ دار بینک ملازم ہو، یا کسی اور ناجائز محکمے میں ملازم ہو، تو اس کے ہاں کھانا کھانا اور اس کا تحفہ قبول کرنے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس کی ساری آمدنی حرام کی ہے، یا اکثر آمدنی حرام ہے، تو اس صورت میں اس کے گھر کھانا کھانا اور اس کا تحفہ قبول کرنا جائز نہیں ہے۔

اگر وہ یہ کہہ دے کہ یہ تحفہ حلال آمدنی سے دے رہا ہوں، تو پھر اس کا تحفہ لینا جائز ہے،

---

(۱) فتاویٰ عثمانی: ۳/ ۳۸۸

(۲) اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۱/ ۱۳۵

ورنہ اس سے تحفہ لے کر کسی غریب کو دیدے۔

اور اگر اس کا اکثر مال حلال ہے، لیکن حرام کی آمیزش بھی ہے، تو اس وقت اس کی دعوت قبول کرنا اور اس کا تحفہ لینا جائز ہوگا، یہ حکم ہر اس شخص کا ہے جو حرام مال کماتا ہو، یا حرام ملازمت کرتا ہو، یا کسی بھی حرام ذریعہ سے اس نے مال کمایا ہو، سب کا حکم یکساں ہے۔

فتاویٰ بینات میں ہے:

(۳) اگر مذکورہ شخص کی ساری آمدنی حرام کی ہے، یا حرام غالب ہے اور دعوت اور تحفہ بھی اسی حرام آمدنی سے دے رہا ہے، تو ایسی دعوت قبول کرنا یا تحفہ لینا جائز نہیں۔ اگر وہ یہ کہہ دے کہ یہ تحفہ حلال آمدنی سے دے رہا ہوں، تو پھر جائز ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"أهدى إلى رجل شيئا أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس، إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي ألا يقبل الهدية ولا يأكل الطعام، إلا أن يخبره بأنه حلال ورثه أو استقرضه من رجل، كذا في الينابيع"۔(۱)

اگر کسی آدمی کو کچھ ہدیہ دیا گیا، یا اس کی مہمان نوازی کی گئی ہو تو دیکھا جائے کہ اس کے مال میں اگر حلال غالب ہے، تو پھر کوئی حرج نہیں، مگر یہ کہ معلوم ہو کہ اس نے حرام سے خرچ کیا ہے (تو پھر جائز نہیں) اور اگر اس کے مال میں اکثریت مال حرام کی ہے، تو پھر ضروری ہے کہ ہدیہ قبول نہ کرے اور اس کی دعوت نہ کھائے، مگر یہ کہ وہ بتادے کہ اس کا ہدیہ اور دعوت حلال مال سے ہے، یا اس کو وراثت میں ملا ہے، یا اس نے کسی سے قرض لیا ہے۔

(۱) الفتاوى الهنديه، كتاب الكراهية: ٥/ ٣٤٢

(۲) فتاویٰ بینات: ٤/ ٧٣

بنک میں ملازم ماموں کے گھر کھانا اور تحفہ لینا

آپ کے مسائل اوران کاحل میں ہے:

سوال: میرے ماموں بنک میں ملازمت کرتے ہیں، جوکہ ایک سودی ادارہ ہے، توکیا ہم ان کے گھر کھانا کھاسکتے ہیں، اوراگر وہ تحفہ وغیرہ دیں تو استعمال کرسکتے ہیں، جبکہ ان کی کمائی ناجائز اور حرام کی ہے، ان کے گھر کھانا کھانے سے ہماری نماز، روزہ قبول ہوگا یانہیں؟

جواب: بنک کی تنخواہ حلال نہیں، ان کے گھر کھانے سے پرہیز کیا جائے اور جو کھالیا ہواس سے استغفار کیا جائے، وہ کوئی تحفہ وغیرہ دیں، توکسی محتاج کو دے دیا جائے۔(۱)

بنک میں ملازم عزیز کے گھر کھانے سے بچنے کی کوشش کریں

سوال: میرے عزیز بنک میں ملازم ہیں، ان کے گھر جب جانا ہوتا ہے، توان کے ہاں چائے وغیرہ پینا کیسا ہے؟ اگرچہ میں دل سے اچھانہیں سمجھتا، مگر قریبی سسرالی رشتہ دار ہونے کے ناتے جاکرنہ کھانا شائد عجیب لگے۔

جواب: کوشش بچنے کی کی جائے اور اگر آدمی مبتلا ہوجائے تو استغفار سے تدارک کیا جائے۔ اگرممکن ہوتواس عزیز کوبھی سمجھایا جائے کہ وہ بنک کی تنخواہ گھر میں نہ لایا کریں، بلکہ ہرمہینے کسی غیر مسلم سے قرض لے کر گھر میں خرچ دے دیا کریں اور بنک کی تنخواہ سے قرض ادا کردیا کریں۔(۲)

---

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ٦/ ٢٥٤

(۲) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ٦/ ٢٥٤

بینک ملازم کی امامت:

بینک کی ملازمت چونکہ جائز نہیں ہے، اس لئے ایسے شخص کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے جو بینک کا ملازم ہو۔ آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

''بنک ملازمت جائز نہیں اور ایسے امام کی امامت مکروہ تحریمی ہے''۔(۱)

احسن الفتاویٰ میں ہے:

''سوال: اوقاف کے ملازم ائمہ جن کی داڑھی مشت سے کم ہے، بینک ملازم حفاظ وقراء ڈاڑھی خور کی اقتداء میں نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب: یہ ڈاڑھی خور بنک میں ملازمت کی وجہ سے سود خور بھی ہے، ان دونوں گناہوں میں سے ہر ایک موجبِ فسق ہے، اس لئے اس کی امامت مکروہ تحریمی ہے''۔(۲)

نوٹ: یہ تو کنوینشل بینکوں کا حکم ہے جہاں پر سودی معاملات کا غلبہ ہوتا ہے، اسلامی بینکوں میں ملازمت کرنا جائز ہے، اس لئے اسلامی بینک میں ملازم کی اقتداء میں نماز بلا کراہت کے صحیح ہے۔

بنک ملازم کو اپنا گھر کرایہ پر دینا:

بنک ملازم کو اپنا گھر کرایہ پر دینا جائز ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ طے کیا جائے کہ اس کا کرایہ بنک سے حاصل ہونے والی حرام آمدن سے نہیں دے گا، اگر وہ یہ قبول کرلے، تو اس کو مکان کرایہ پر دینا جائز ہے، لیکن اگر اس کا کوئی اور ذریعہ آمدن نہ ہو، تو پھر چونکہ وہ گھر کا کرایہ اسی حرام رقم سے ادا کرے گا، اس لئے ایسی صورت میں بنک ملازم کو گھر کرایہ پر دینا

---

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۲/ ۲۴

(۲) احسن الفتاویٰ: ۳/ ۳۰۲

درست نہیں ہے۔

اسی طرح اگر بنک ملازم نے مال حرام سے گھر بنایا اور وہ گھر کرایہ پر دیا، تو کیا اس گھر میں کوئی دوسرا شخص کرایہ پر رہ سکتا ہے یا نہیں؟ یعنی بنک ملازم کے گھر میں کرایہ پر رہنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے ایسے شخص کے گھر میں کرایہ پر رہنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، بہتر تو یہی ہے کہ ایسے لوگوں کا کرایہ دار نہ بنا جائے، لیکن اگر کوئی رہے گا تو جائز ہوگا، البتہ اس میں ایک طرح کی کراہت ہے کہ حرام مال سے بنے ہوئے گھر کو استعمال کرنا لازم آئے گا۔

جائز ملازمت چھوڑ کر بینک یا انشورنس کمپنی میں ملازمت کرنا:

بہت سارے لوگ اچھی جگہ ملازمت کر رہے ہوتے ہیں، لیکن تنخواہ کم ہونے کی وجہ سے وہ لوگ سودی بینک یا بیمہ کمپنیوں کی طرف رجوع کرتے ہیں، بیمہ کمپنی یا بینک میں تنخواہ زیادہ ہوتی ہے، شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں ہے، کہ حلال ذریعہ آمدن کو چھوڑ کر حرام ذریعہ آمدن اپنایا جائے، یہ بدبختی کی علامت ہے، محرومی کی نشانی ہے، کیونکہ حلال مال اگر چہ کم ہوتا ہے، لیکن اس میں اللہ کی طرف سے برکت ہوتی ہے، اور مال حرام بظاہر زیادہ ہوتا ہے، لیکن اس میں بے برکتی ہوتی ہے، اس لئے حلال ملازمت یا ذریعہ معاش کو چھوڑ کر ناجائز ملازمت یا نوکری اختیار نہ کی جائے۔

اکاؤنٹینٹ کی آمدنی کا حکم

مختلف کمپنیوں یا فرموں میں اکاؤنٹینٹ (محاسب) اور آڈیٹر ہوتے ہیں، جو ان کے حسابات کو چیک کرتے ہیں، ان کا پیشہ حسابات کا چیک کرنا یا درکھنا ہوتا ہے۔ یہ کمپنیاں یا فرم بینک سے قرض لئے ہوئے ہوتے ہیں، یا اپنی رقم سودی کھاتے میں رکھوائی ہوتی ہے، سود ملتا ہے ان کا اندراج ان کی کاپیوں میں کرنا ہوتا ہے یا اس کی چیکنگ کرنی ہوتی ہے، تو

خیال ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے جو کاتب ربا پر لعنت فرمائی تو یہ کاتب ربا میں داخل ہے۔

لیکن اس حدیث کی شرح میں علماء کرام نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کاتب ربا کی اس وعید میں نہیں، کاتب ربا کی وعید اس شخص پر صادق آتی ہے جو ربا کا معاون ہے اور ربا کا معاہدہ لکھتا ہے، اور جس نے محض لکھا اور صرف حساب کی چیکنگ کی تو وہ اس وعید میں بظاہر داخل نہیں، یہ اور بات ہے کہ ربا ایسی چیز ہے کہ جس طرح عین ربا کا ارتکاب حرام ہے، اس کے مشابہ اور اس کے اندر جہاں شبہات ہوں اس کو بھی آدمی ترک کرے اور اس سے پرہیز کرے، تو بہتر ہے، لیکن یہ نہیں کہا جائے گا کہ اکاؤنٹینٹ کی آمدنی اس کی وجہ سے حرام ہوگئی (بلکہ اس کی آمدنی حلال ہے)(۱)

سینما کی ملازمت:

سینما کی ملازمت کرنا ناجائز اور حرام ہے اور حاصل ہونے والی آمدنی بھی حرام ہے، سینما کی ملازمت یقیناً تعاون علی الاثم ہے جو حرام ہے، ایسے ملازم کو تنخواہ مال حرام سے ملے گی، اگرچہ وہ سینما میں کوئی جائز کام کیوں نہ کرے، فلم اور سینما خباثتوں کی جڑ ہے، جس سے جنسی انارکی اور بے حیائی پھیلتی ہے، معاشرہ میں اخلاقی تنزل اور انحطاط پیدا ہوتا ہے۔ نیم عریاں، تنگ لباس، فاحشہ و بے حیاء عورتوں کی نمائش کرائی جاتی ہے، گویا سینما بے حیائی کا اڈا ہے، مفتی رشید احمد صاحبؒ لکھتے ہیں

"سوال: سینما میں ملازمت کی تنخواہ حلال ہے، یا حرام؟

الجواب باسم ملہم الصواب: حرام ہے اس کی دو وجوہ ہیں (۱) اگر اس کے ذمے کوئی ناجائز کام ہے، تو اس کا گناہ، ورنہ تعاون علی الاثم تو ہے ہی (۲) تنخواہ حرام آمدن سے ملے گی"۔(۲)

---

(۱) اسلام اور جدید معاشی مسائل :۱/ ۱۳۵

(۲) احسن الفتاوی :۷/ ۳۱۶

شراب کے اداروں میں ملازمت

شراب کا پینا، اس کا پلانا، بنانا، بیچنا سب ناجائز اور حرام ہیں، اس لئے اسلام نے شراب کے استعمال اور اس کی خرید وفروخت کو حرام قرار دیا ہے، شراب کو حرام جاننا اور سمجھنا ایمان کا حصہ ہے اور اس کی حرمت سے انکار کرنا کفر ہے، شراب کو تیار کرنا حرام ہے اور شراب بنانے والا تعزیر کا مستحق ہے، اس لئے کسی بھی شراب بنانے والی فیکٹری میں ملازمت کرنا ناجائز اور حرام ہے، اور ملنے والی تنخواہ کا بھی یہی حکم ہے، شراب اور خنزیر کا گوشت جس طرح پینا اور کھانا جائز نہیں ہے، اسی طرح کسی کو پلانا اور کھلانا بھی جائز نہیں ہے، کسی بھی ایسی فیکٹری میں کام کرنا حرام ہے، جہاں شراب تیار کی جاتی ہو، اس لئے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ ایسے ہوٹل میں ملازمت کرنا بھی جائز نہیں ہے، جہاں پر گاہکوں کے سامنے شراب پیش کی جاتی ہو، ایسی ملازمت پر ملنے والی تنخواہ بھی حرام محض ہے۔

درمختار میں ہے:

"لا عصرها لقيام المعصية بعينه"۔(۱)

یعنی شراب بنانے کے لئے انگور کا نچوڑنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ گناہ بعینہٖ قائم ہے، اسی طرح شراب بنانے والی فیکٹری میں کام کرنا یا ہوٹل میں شراب پینے کے لئے پیش کرنا یہ بھی گناہ میں تعاون ہے، جو نص قطعی سے حرام ہے۔

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی مدظلہ العالی لکھتے ہیں:

"ایک مسلمان کے لئے غیر مسلم کے ہوٹل میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے، بشرطیکہ وہ مسلمان شراب پلانے یا خنزیر یا دوسرے محرمات کو غیر مسلموں کے سامنے پیش کرنے کا عمل نہ کرے، اس لئے کہ شراب پلانا یا اس کو دوسروں

(۱) الدر المختار: ۹/ ٦٤٦

کے سامنے پیش کرنا حرام ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لعن الله الخمر و شاربها و ساقيها و بائعها و مبتاعها و عامرها و متصرفها و حاملها و المحمولة إليه "۔(۱)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے شراب، اس کے پلانے والے، اس کے بیچنے والے، اس کو خریدنے والے، اس کو نچوڑنے والے، اور جس کے لئے نچوڑا جائے ان سب پر لعنت فرمائی ہے۔

ترمذی شریف میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے:

"لعن رسول الله ﷺ في الخمر عشرة عاصرها و معتصرها و شاربها و حاملها و المحمولة إليه و ساقيها و بايعها آكل ثمنها والمشتري لها والمشتراة لها"۔(۲)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے شراب سے متعلق دس اشخاص پر لعنت فرمائی ہے، شراب نچوڑنے والا، جس کے لئے نچوڑی جائے، بیچنے والا، شراب بیچ کر اس کی قیمت کھانے والا، اس کو پینے والا، پلانے والا، اٹھانے والا، جس کے لئے اٹھائی جائے، خریدنے والا، جس کے لئے خریدی جائے۔

مندرجہ بالا احادیث سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ شراب کی تجارت بھی حرام ہے اور اجرت پر ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کر لے جانا یا پلانا سب حرام ہے، اور حضرت ابن عباسؓ کے فتویٰ سے یہ بات بھی واضح ہوگئی، کہ اگر

---

(۱) ابوداؤد، کتاب الاشربة، حدیث: ۳۶۷۴ ۔جلد ۳ / ۳۲۶

(۲) ترمذی، کتاب البیوع: ۱/۳۷۴

کسی علاقے میں شراب بنانے اور اس کی خرید وفروخت کا عام رواج ہو، وہاں بھی کسی مسلمان کے لئے حصول معاش کے طور پر شراب کا پیشہ اختیار کرنا حلال نہیں ہے"۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ آج کل جو مسلمان طلباء غیر مسلم ممالک کا سفر کر کے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اس دوران معاشی اخراجات پورے کرنے کیلئے ایسے ہوٹلوں میں ملازمت اختیار کرتے ہیں جن میں شراب اور خنزیر کی خرید وفروخت ہوتی ہے، جس میں گاہکوں کے سامنے شراب اور خنزیر وغیرہ پیش کیے جاتے ہیں، تو ایسی ملازمت سے حاصل ہونے والی آمدنی خالص حرام اور ناجائز ہے، جس کا استعمال کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے، بلکہ ایسی تنخواہ واجب التصدق ہے۔

امداد الفتاویٰ میں ہے:

"سوال: کسی شخص نے ایک کسبی، مے فروش یا سود خور کی نوکری کی اور تینوں کی نوکری محض حرام ہے، تو اب اس کو جو مال حرام سے تنخواہ ملی حلال ہے یا نہیں؟ یا کسی شخص نے اپنے گیہوں یا کوئی اور چیز مے فروش کے ہاتھ فروخت کی اور اس نے اس آمدنی ناجائز سے آمدن دی، تو وہ اب اس کو حلال ہے یا نہیں؟ اس مسئلے کی اچھی طرح تشریح فرمائیں۔

الجواب: جن کی آمدنی بالکل حرام خالص ہے، جیسے کسبی، مے فروش، یا سود خور وغیرھم ان کی نوکری کرنا ناجائز ہے اور اسی طرح اپنی چیز ان کے ہاتھ فروخت کر کے اس مال حرام میں سے قیمت لینا بھی حلال نہیں، قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی ﴿وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ﴾(۲) تو اپنی پاکیزہ مزدوری یا پاکیزہ چیز کو اس ناپاک مال سے بدلنا ناجائز ٹھہرا۔"(۳)

---

(۱) فقہی مقالات: ۱/ ۲۵۱ (۲) سورہ النساء، آیت: ۲

(۳) امداد الفتاویٰ: ۳/ ۳۷۷

شراب وغیرہ اشتہار کی ملازمت:

اگر کوئی ایسی فیکٹری ہے جہاں پر صرف اور صرف شراب کے اشتہار ہی بنتے ہوں، جیسے کسی کا پریس ہو جس میں صرف شراب ہی کی تشہیر وغیرہ کا مواد چھپتا ہو، اور کسی جائز چیز کا اشتہار نہ بنتا ہو، تو ایسی فیکٹری و پریس میں ملازمت کرنا جائز نہیں ہے، البتہ اگر اصل کام حلال ہو، لیکن کبھی کبھار شراب کا اشتہار بھی بنا لیتے ہوں، تو پھر ایسی فیکٹری و پریس میں ملازمت کرنا درست اور جائز ہے۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

''سوال: ایک فیکٹری میں شراب وغیرہ کا اشتہار بھی ہوتا ہے جو کہ حرام چیزوں میں سے ہے، اصل کام دوسرا ہے، کیا اس جگہ کی آمدنی میرے لئے درست ہے؟

جواب: جب اصل کام شراب کے اعلان واشتہار کا نہیں، بلکہ جائز چیز کا ہے، تو ملازمت جائز ہے، شراب کے متعلق جہاں تک ہو سکے بچنا چاہئے۔''(۱)

اس لئے کوئی شخص کسی ایسے محکمے میں ملازم ہے، تو اسے چاہئے کہ فوراً ایسی ملازمت کو چھوڑ کر کوئی جائز ملازمت اختیار کرے۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

''سوال: زید جہاز میں چیف آفیسر ہے، ان کے فرائض میں سے ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ جہاز کے عملہ اور مسافروں کے لئے شراب خریدے اور بوقت طلب ان کو مہیا کرنے کا انتظام کرے، زید انتظامیہ سے کئی مرتبہ اس کو اس کے فرائض سے خارج کرنے کا مطالبہ کر چکا ہے، مگر انتظامیہ اور کپتان ''عدم

(۱) فتاوی محمودیہ: ۱۷ / ۱۱۷

اداءِ فرض'' (چارج شیٹ) کی دھمکی دیتے ہیں، کوشش کرنے سے پاکستانی جہاز پر ملازمت مل سکتی ہے، مگر تنخواہ کا بہت فرق ہے، یہاں ساڑھے پانچ ہزار ہے اور پاکستانی جہاز پر سولہ سو ہوگی، ایسی صورت میں یہ ملازمت زید کے لئے جائز ہے، یا ترک کردے۔

الجواب باسم ملہم الصواب: اس ملازمت کا چھوڑنا فرض ہے، بالخصوص جبکہ پاکستانی جہاز پر ملازمت بھی مل سکتی ہے، حلال کی قلیل آمدن میں حرام کی کثیر آمدن سے کہیں زیادہ برکت ہے''۔ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (۱)

جس دکان میں شراب کے علاوہ اور چیزیں بھی بکتی ہیں اس میں نوکری کرنا

''سوال: (۱۳۸) ایک دکان میں شراب بھی بکتی ہے اور دیگر اشیاء سوداگری بھی بکتی ہیں، کیا اس دکان میں نوکری کرنا جائز ہے، یا نہیں؟

الجواب: جس دکان میں شراب بکتی ہے، اس دکان کی نوکری کرنی درست نہیں ہے، کیونکہ غالباً گاہ بگاہ اس نوکر کو بھی شراب فروخت کرنا ہوگا اور یہ حرام ہے اور حساب وکتاب اس کا لکھنا یہ بھی حرام ہے اور تقاضا کرنا اس کی قیمت کا یہ بھی حرام ہے، غرض یہ کہ ہر قسم کی شرکت واعانت اس میں ہونا سب ناجائز اور حرام ہے، مسلمانوں کو ایسی نوکری کرنا درست نہیں ہے''۔ (۲)

شراب کے علاوہ جو دوسری حرام اور نشے والی اشیاء ہیں، چونکہ وہ بھی حرام ہیں، اس لئے کسی بھی ایسی فیکٹری یا ادارہ میں جہاں پر نشہ والی چیزیں بنتی ہیں، ملازمت کرنا جائز نہیں ہے اور اس کی تنخواہ بھی حلال نہیں ہوگی، ناجائز ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ تعاون علی الاثم ہے۔

---

(۱) احسن الفتاویٰ: ۸ / ۲۲۶

(۲) فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۱۵ / ۳۲۰

امداد الفتاویٰ میں ہے:

''سوال نمبر ۳۴۶) سررشتہ مسکرات مثل آبکاری وافیون وغیرہ میں اہل اسلام کو نوکری کرنا کیسا ہے، اور ایسے ملازم قابل امامت ہیں یا نہیں؟

الجواب: نوکری کرنا ایسے کارخانوں میں جائز نہیں، کہ اعانت علی المعصیت ہے۔''

"قال الله تعالیٰ ﴿ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾(١)

" وعن أنس قال لعن رسول الله ﷺ فی الخمر عشرہ عاصرها و شاربها وحاملها والمحمولة إليه وساقيها وبايعها وآكل ثمنها والمشتری لها والمشتری له"۔(٢)

اور افیون کا استعمال جس صورت میں ناجائز ہے، اس کے اعتبار سے تو اس کا حکم مثل خمر کے ہے۔

"فالمعين فی ذاك كالمعين فی هذا، لقوله عليه السلام ألا إن كل مسكر حرام وكل مقير حرام وكل مخدر حرام"۔ (٣)

جس صورت میں استعمال جائز ہے، اسکے اعتبار سے اسکی بیع سے روکنا دوسروں کو ظلم ہے اور ظلم کی اعانت بھی حرام ہے، غرض ہر حال میں یہ شخص بھی معین ہے فعل ناجائز کا، اور یہ لوگ بھی فاسق ہیں، ان کی امامت بھی مکروہ ہے۔ (۴)

---

(١) سورہ مائدہ، آیت: ٢

(٢) جامع الترمذی، کتاب البیوع: ٢/ ٣٨٠۔ رقم الحدیث: ١٣١٣

(٣) جامع المسانید والسنن۔ رقم الحدیث: ٥٤٥ ۔ الخبر أورده ابن الأثير فی ترجمة أنس بن حذيفة. أسد الغابة: ١/ ١٤٦

(٤) امداد الفتاویٰ: ٣/ ٣٧٩

قادیانی کمپنی میں ملازمت:

ایک مسلمان کے لئے کسی کافر کے ہاں ملازمت کرنا جائز ہے، جس میں کوئی حرج نہیں، لیکن قادیانی چونکہ مرتد ہیں، اور اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلامی لیبل لگا کر کفر کا پرچار کر رہے ہیں، اس لئے قادیانیوں کی کمپنی میں ملازمت کرنا ناجائز اور حرام ہے، قادیانیوں کا حکم عام کفار سے الگ ہے، کیونکہ یہ مرتدین ہیں، ان کے ساتھ کسی قسم کا معاملہ یا لین دین کرنا حرام ہے، اور اسلامی غیرت کے بھی خلاف ہے۔

محکمہ پولیس میں ملازمت کرنا:

پولیس کے محکمے میں ملازمت کرنا جائز ہے، اور اس میں شرعا کوئی قباحت نہیں ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ جو ڈیوٹی لگی ہو اس کو اچھی طرح ادا کرے، وقت کی پابندی کرے، کسی پر ظلم وزیادتی نہ کرے، اور ظالم کی ناحق حمایت نہ کرے، تو ایسی ملازمت جائز ہے، لیکن جو تنخواہ مقرر ہے، صرف وہی لے سکتا ہے، تنخواہ کے علاوہ چائے پانی کے نام سے جو پولیس والے لوگوں سے بھتہ لیتے ہیں یہ شرعا ناجائز ہے، یہ رشوت ہے اور حرام ہے۔

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

"سوال: ایک شخص جو کہ پہلے پولیس میں ملازم تھا، اور اب ایک شراب کی کمپنی میں ملازم ہے، کیا اس کی روزی حلال ہے؟ اور اس کے اہل وعیال پر کیا واجب ہے؟

جواب: اگر رشوت اور دوسرے ناجائز ذرائع آمدنی سے اجتناب کیا جائے، تو پولیس کی ملازمت تو جائز ہے، البتہ شراب تیار کرنے، یا بیچنے والی فرم کی ملازمت حرام ہے، اور آمدنی بھی حرام ہے، ایسے شخص کے اہل وعیال کو چاہئے

کہ وہ اسے جائز آمدنی کے ذرائع اختیار کرنے پر مجبور کریں"۔(۱)

محکمہ فوج میں ملازمت کرنا :

ایک مسلمان ملک کے شعبہ فوج میں ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے، اور اس ملازمت سے حاصل ہونے والی تنخواہ بھی حلال ہے، اس لئے کہ فوج ہر ملک کی ضرورت ہوتی ہے، جو ملک کے سرحدوں کی حفاظت کرتی ہے، لیکن اگر کسی جگہ فوج کو اسلام اور مسلمان کا صفایا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہو، اور فوج کا کام بے گناہ مسلمانوں کا مارنا ہو، یا ان پر ظلم وستم کرنا ہو، تو ایسے محکمے میں ملازمت کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

بلکہ ایسی ملازمت کو رد کرنا ضروری ہے، اسلئے کہ یہ ظلم میں تعاون ہے، جو ناجائز ہے۔

محکمہ اوقاف کی ملازمت جائز ہے:

محکمہ اوقاف میں اگر خلاف شرع کوئی کام نہ ہو تو محکمے اوقاف میں ملازمت کرنا جائز ہے۔ احسن الفتاویٰ میں ہے:

"سوال: اوقاف کی ملازمت مثلاً امامت خطابت وغیرہ جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ اوقاف کی اکثر مدات ناجائز ہیں، اور حکومت نے اس محکمہ کو بالکل الگ رکھا ہے، یا کہ سرکاری املاک میں پہنچنے کے بعد پھر وہاں سے اس محکمے کے ملازمین کو تنخواہ ملتی ہے، ذرا تفصیل فرمادیں۔ بینوا وتوجروا

الجواب باسم ملہم الصواب: اوقاف کی اکثر آمدن کے ناجائز ہونے کا کوئی ثبوت نہیں، اس لئے ملازمت جائز ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی شرط خلاف شرع نہ ہو"۔ واللہ اعلم (۲)

---

(۱) فتاویٰ عثمانی : ۳ / ۳٦٥

(۲) احسن الفتاویٰ : ٦ / ٤١٦

حرام آمدن والوں کے ہاں ملازمت کرنے کا حکم:

جن لوگوں کی آمدنی حرام ہے، ان لوگوں کے ہاں نوکری کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر ملازم کوئی ناجائز کام نہ کرتا ہو، یعنی ملازم کے ذمے جو کام ہے، وہ کام بذات خود جائز ہو، اور اس کو تنخواہ جو دی جاتی ہو، وہ حرام آمدن سے نہ دی جاتی ہو، یعنی اس شخص کا کوئی جائز کام بھی ہو، جس سے اس کے پاس حلال آمدن بھی آتی ہو اور اس حلال آمدن سے اس ملازم کو تنخواہ دیتا ہو، تو اس صورت میں حرام آمدن والے کے پاس ملازمت کرنا جائز ہے۔

اور اگر ملازم کوئی خلاف شرع کام کرتا ہو، یا اس کو تنخواہ حرام مال سے دی جاتی ہو، تو یہ ملازمت کرنا جائز نہیں ہے، ایسی ملازمت کو چھوڑنا ضروری ہے۔

اس سلسلے میں حضرت اقدس حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک مدلل فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:

> ”سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ کسی شخص نے ایک کسبی یا سود خوری یا شراب فروش کی نوکری کر لی، یا کسی ایسے شخص نے اپنے گندم یا کوئی اور چیز کسی شراب فروش کے ہاتھ فروخت کی اور اس نے آمدن ناجائز سے قیمت دی، تو اب اس کے لئے وہ قیمت حلال ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ کی اچھی طرح تشریح فرمائیں۔
>
> جواب: جن کی آمدنی بالکل حرام خالص ہے، جیسے کسبی، یا شراب فروش یا سود خوری وغیرہ، ہم ان کی نوکری کرنا جائز نہیں، اور جو تنخواہ اس میں ملتی ہو وہ حلال نہیں اور اسی طرح اپنی چیز اس کے ہاتھ فروخت کر کے اسی مال حرام سے قیمت لینا بھی حلال نہیں۔

قال الله تعالىٰ ﴿وَلَاتَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ﴾(۱)

تو اپنی پاکیزہ مزدوری کو یا پاکیزہ چیز کو ناپاک مال سے بدلنا ناجائز ٹھہرا۔

"وقال رسول الله ﷺ لايحل ثمن الكلب ولا حلوان الكاهن ولا مهر البغي۔(۲)

وقال عليه السلام:" إن الله حرم الخمر وثمنها "۔(۳)

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال رأيت رسول الله ﷺ جالسا عند الركن، قال فرفع بصره إلى السماء، فضحك، فقال: لعن الله اليهود ثلاثا: إن الله حرم الشحوم فباعوها واكلو ثمنها، وإن الله تعالىٰ إذا حرم على قوم أكل شيء حرم عليه ثمنه"۔(٤)

لعن رسول الله اكل الربا وموكله۔(٥)

ہاں جن لوگوں کی آمدنی مشتبہ اور مختلط الحلال والحرام غالب الحلال ہو، مثلاً یہی لوگ کسبی، مے فروش وسود خور وغیرہم کوئی دوسرا پیشہ مباح مثلاً حلال تجارت اور کچھ اور بھی کرتے ہوں، اس وقت ان کے ہاں نوکری کرنا اور اپنی چیز ان کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے، بشرطیکہ تنخواہ یا قیمت حلال مال میں سے دیں، یا غالب الحلال سے دیں۔

"نهانا ﷺ عن كسب الأمة إلا ماعلمت سيدها وقال هكذا باصابعه نحو الخبز والنقش"۔(٦)

---

(۱) سورۃ النساء، آیت:۲

(۲) سنن ابوداؤد:(۲/ ۱۳٦)

(۳) سنن ابوداؤد:(۲/ ۱۳۷)

(٤) سنن ابوداؤد:(۲/ ۱۳۷)

(٥) سنن ابوداؤد:(۲/ ۱۳۷)

(٦) ابوداؤد: ۲/ ۱۳

وجہ یہ ہے کہ مشتبہ سے بچنا متعذر اور دشوار ہے، پس ضرورت کی وجہ سے جائز ہے، لأن الضرورات تبیح المحظورات ولایکلف الله نفسا إلا وسعها۔ اگرچہ خلاف تقوی ہے دع مایریبك إلی مالا یریبك۔ هو الموافق (۱)

ایسی دکان میں ملازمت جس میں جائز اور ناجائز اشیاء فروخت ہوتی ہوں:

امدادالاحکام میں ہے:

''سوال: ایک بڑی دکان پر مختلف قسم کی اشیاء جائز وناجائز فروخت ہوتی ہیں، مگر بمقابلہ اشیاء ناجائز کے کثرت اشیاء جائزہ کی ہے، یہ بات ضروری ہے معاملات بیع وشراء میں سودی معاملہ بھی کبھی برتا جاتا ہے، اگرچہ تاجر دکان مشتری سے سود لیتا تو کم ہے، مگر بعض اوقات خود دوسرے کو دینے سے چارہ نہیں ہوتا، اس دکان پر متعدد ملازم ہوتے ہیں جن میں بعض جاہل محض ہوتے ہیں، اور بعض کچھ شد بد والے، یہ ملازم دغا (دھوکہ) کذب وغیرہ بے کھٹکے اعلیٰ درجہ کا برتتے ہیں اور مالک دکان باوجود وقوف وآگہی کے ان افعال پر ملازمین میں سے کچھ تعرض نہیں کرتا، حاصل یہ ہے کہ اس دکان پر ایک روپیہ میں آٹھ آنہ سے زائد کی نسبت سے لین دین کذب دغا پر کی جاتی ہے، اور بعض معاملات بیع فاسد کے بھی ہوتے ہیں، مگر یہ بیع فاسد کے معاملات بوجہ لاعلمی مسائل فقہیہ ہوتے ہیں پس ایسی دکان پر ملازمین از قسم منشی گری یا تعلیم اطفال یا خرید وفروخت اشیاء دوکان درست ہے یا نہیں؟ اور یقین کامل ہے کہ تنخواہ اس ہی رقم سے ملے گی اور ایسی دکان پر بطور مہمان دعوت کھانا یا پان

---

(۱) امداد الفتاوی: ۳ / ۳۷۸

وچائے معمولی اشیاء دوستانہ رسم کی خورد ونوش درست ہے یا نہیں؟

جواب: سود دینے سے دکان کے مال میں حرمت نہیں آتی، دینے والوں کو گناہ ہوتا ہے، اگر بدوں سخت مجبوری کے دیں اور سود لینا مسلمان سے تو قطعاً حرام ہے اور کفار سے لینا بھی بعض علماء کے نزدیک حرام ہے، مگر جب وہ قلیل ہے اور زیادہ آمدنی بے سودی ہے، تو ملازم دوکان کو تنخواہ لینا جائز ہے، جب کہ تنخواہ مال مخلوط سے دی جائے اسی طرح جب اشیاء حلال زیادہ ہے، تو غلبہ حلال کو ہے اور ملازموں کے دغا وفریب سے ان کو گناہ عظیم ہوتا ہے، اس طرح دکاندار کو بھی اگر وہ اس سے واقف ہے، لیکن جو قیمت حاصل ہوتی ہے، وہ حلال ہے، گو کراہت سے خالی نہیں، لیکن دکاندار کی ملک ہو جاتی ہے، اسی طرح بیع فاسد میں قبضہ سے دوکان کی ملک ہو جاتی ہے، البتہ کراہت وخبث ضروری ہے، اب اگر ملازم دکان کو یہ معلوم ہو کہ تنخواہ جو مجھے دی گئی یہ بیع فاسد کے ثمن سے دی گئی ہے، یا سود کی آمدنی سے، جب تو اس کا لینا درست نہیں۔ اور اگر سب مخلوط ہو اور اس کو معلوم نہ ہو کہ یہ تنخواہ بیع صحیح کی قیمت سے ہے یا فاسد کی تو تنخواہ لینا حلال ہے۔

قال في الاشباه :غلب على ظنه أن أكثر بياعات أهل السوق لا تخلو عن الفساد ، فإن كان الغالب هو الحرام تنزه شرائه ، لكن مع هذا لو اشتراه يطيب له۔

قال الحموی ووجهه إن كون الغالب هو الحرام لا يستلزم كون المشترى حراماً لجواز كونه من الحلال المغلوب و الأصل الحل ۔(١)

---

(١) امداد الاحکام:(۳ / ۵۵۰)

پٹواری کی ملازمت کا حکم:

پٹواری اگر اپنا کام ایمانداری سے انجام دے، اس میں جھوٹ نہ بولے، کسی کے ساتھ دھوکہ دہی نہ کرے، تو اس کی ملازمت شرعاً جائز ہے اور اس کی تنخواہ بھی حلال ہے، کیونکہ اس کا کام تو صرف کاغذات میں اندراج ہوتا ہے، اگر اس میں صحیح طریقہ سے اندراج کرے، کسی ظالم کا ساتھ نہ دے، تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں۔

کفایت المفتی میں ہے:

''سوال: موجودہ ملازم پٹواری جائز ہے، یا نہیں؟ پٹواری کو آڑ رہن کے متعلق اور رہن باقبضہ کے متعلق روزنامچے میں اندراج کرنا پڑتا ہے، اور انتقال بھی درج ہوتا ہے، آڑ رہن کا سود مرتہن لیتا ہے، رہن باقبضہ میں بھی مرتہن فائدہ اٹھاتا ہے، سود اور رہن زمین کا منافع شریعت میں حرام ہے، لوگ انتقال وراثت لڑکوں کے نام درج کراتے ہیں، اس میں لڑکیوں کا حصہ غصب ہوتا ہے، جملہ مسلمانوں کے مواضعات میں بھی، اور جملہ ہندوؤں کے مواضعات میں بھی، اور جو مواضعات مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترک ہیں، ان سب میں ایسا ہی عمل ہوتا ہے ان تینوں صورتوں میں کیا حکم ہے؟

جواب: پٹواری کا کام کاغذات میں اندراج کرنا ہے، اور اگرچہ یہ بھی فی الجملہ معاونت ہے، لیکن یہ اس کے اپنے ضمیر کے تقاضے سے نہیں ہے، ورنہ اس کا اندراج سود کی دستاویز کا حکم رکھتا ہے، اس لئے موجودہ حالات وواقعات کے اندر یہ ملازمت مباح ہے۔ (۱)

---

(۱) کفایت المفتی: ۷/ ۳۰۹

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

''پٹواری کا کام فی نفسہ جائز ہے، البتہ رشوت وغیرہ کے ناجائز ذرائع استعمال کرنا حرام ہے، لہٰذا اس علاقے میں پٹواری کا نظام نافذ کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور جب حکومت اسے نافذ کرنا چاہتی ہے، تو اس جائز اقدام میں اس کی اطاعت ضروری ہے''۔(۱)

واپڈا کی ملازمت کا حکم:

واپڈا محکمے میں ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے، اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، ملازم وقت کی پابندی کرے، اپنا کام ذمہ داری سے انجام دے، کام میں کوتاہی نہ کرے، تو واپڈا کی ملازمت میں کوئی حرج نہیں۔

فری یونٹ کی خرید وفروخت کا حکم:

واپڈا کے ملازمین کو محکمے کی طرف سے فری یونٹ ملتے ہیں، یہ یونٹ کمپنی کی طرف سے ملازم کے لئے بوجہ ملازمت کے ایک رعایت ہوتی ہے، جس سے ملازم فائدہ اٹھا سکتا ہے، بعض ملازمین یہ فری یونٹ کسی کو ہبہ کر دیتے ہیں، یا کسی کو بیچ دیتے ہیں، شرعاً ملازم کے لئے ان یونٹس کو آگے بیچنا یا کسی کو ہبہ کرنا جائز نہیں ہے۔

فتاویٰ عباد الرحمٰن میں ہے:

''سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی واپڈا میں ملازم ہے اور واپڈا والے کمپنی ہر ملازم کو اس کے سکیل کے بقدر بجلی کے کچھ یونٹ مفت دیتے ہیں، یہ یونٹس کمپنی کی طرف سے رعایتی ہوتے ہیں،

---

(۱) فتاویٰ عثمانی:(۳ / ۳۶۲) وھکذا فی امداد الفتاویٰ :(۳ / ۴۰۲)

اب پوچھنا یہ ہے کہ ان یونٹوں کو کسی دوسرے آدمی کو ہبہ کرنا یا فروخت کرنا کیسا ہے؟

جواب: واپڈا والے یہ یونٹس اپنے ملازم کو اباحۃً دیتے ہیں، تملیکاً نہیں دیتے، یعنی اتنی یونٹس تک استعمال مفت قرار دیتے ہیں، جس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر واپڈا والے کو معلوم ہو جائے کہ اس ملازم نے ان یونٹوں کو بیچ دیا ہے، یا کسی کو ہبہ کر دیا، تو یہ قانونی جرم شمار کیا جاتا ہے اور ان کی طرف سے قانونی کاروائی کی جاتی ہے، لہذا رعایتی یونٹ کسی کو ہبہ کرنا یا آگے بیچنا صحیح نہیں ہے"۔(۱)

واپڈا کے ملازم کے لئے عام صارفین سے کچھ لینا جائز نہیں

واپڈا ملازم اگر کسی کا کام کرنے جاتے ہیں، مثلاً کسی کا میٹر خراب ہے، یا ٹرانسفارمر خراب ہو گیا ہو، ٹھیک کرنے کے بعد ملازم کے لئے ان سے کچھ اجرت کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے، البتہ اگر وہ لوگ خود اپنی مرضی سے کچھ رقم دیدیں، تو ملازم کے لئے لینا جائز ہے، کیونکہ ملازم کو اسی کام کی تنخواہ ملتی ہے، لوگوں سے مطالبہ کرنا رشوت ہے۔

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

"سوال: واپڈا میں ملازمت کے دوران جب عام صارفین میں سے کسی کی بجلی خراب ہو جائے، تو اس کو ٹھیک کرنے کے بعد جو معاوضہ ملتا ہے، وہ لینا جائز ہے؟ اگرچہ گورنمنٹ تنخواہ ادا کرتی ہو۔

جواب: اگر سرکاری ضابطہ کے مطابق عام صارفین سے معاوضہ وصول کرنے کی اجازت ہو (اجازت نہیں ہوتی، مرتب) یا صارفین ازخود بلا مطالبہ

---

(۱) فتاوی عباد الرحمن: ٤/ ٤٦١

از روئے ہمدردی وتعاون کچھ دے دیں، تو یہ معاوضہ وصول کرنا جائز ہے، ورنہ جائز نہیں ہے۔(۱)

محکمہ خوراک کی ملازمت:

اگر محکمہ خوراک کا ملازم دیانت داری سے اپنا فرض ادا کرتا ہے اور وقت کی پابندی کرتا ہے، تو یہ ملازمت جائز ہے اور حاصل ہونے والے آمدنی بھی حلال ہے۔

جاسوسی کے محکمے میں ملازمت کرنے کا حکم:

جاسوسی کے محکمے میں بہت خلاف شرع کام کرنے پڑتے ہیں، بظاہر بہت سے کام اسلام کے خلاف کرنے ہوتے ہیں، جھوٹ بولنا پڑتا ہے، بسا اوقات دھوکہ بھی دیا جاتا ہے، الغرض بے شمار کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، لیکن ان کا مقصد اپنے ملک کی حفاظت کرنا ہوتا ہے، تو کیا ایسے حالات میں جاسوسی کے محکمے میں ملازمت کرنا جائز رہتا ہے، یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شرعی حدود میں رہتے ہوئے جاسوسی کے محکمے میں نوکری کرنا جائز ہے، بعض دفعہ اگر ملک کی حفاظت کی خاطر اور لوگوں کے جانوں کی حفاظت کے خاطر کچھ باتیں یا کام خلاف شرع بھی کرنے پڑتے ہوں، تو بھی اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، چنانچہ بخاری شریف میں ہے ۔

حضور ﷺ نے تین صحابہ ابو مرثدؓ، زبیر، اور علیؓ کو ایک عورت کے پیچھے بھیجا اور عورت خاطب بن ابی بلتعہ کا خفیہ خط مشرکین مکہ کے پاس لے کر جارہی تھی، انہوں نے مدینہ منورہ سے بارہ میل کے فاصلے پر اس عورت کو پکڑ لیا، انہوں نے اس عورت سے کہا کہ تمہارے پاس جو خط ہے اس کو نکالو، وہ خط ہمیں دے دو، عورت نے کہا میرے پاس خط نہیں ہے، اس

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۲ / ۳۵۱ ۔ از مفتی نظام الدین شامزیؒ

نے اپنے کپڑے جھاڑے، اس کے سامان کی تلاشی لی گئی، لیکن نہ ملا، حضرت علیؓ نے کہا خط نکالو، ورنہ ہم تم کو ننگا کر دیں گے، جب عورت کو یقین ہوا کہ یہ لوگ کسی بھی حالت میں چھوڑنے والے نہیں ہیں، تو اس نے اپنی مینڈیا سے خط کو نکالا، اور خط ان کے حوالے کیا، (مختصراً) اس باب کو امام بخاری نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے اور اس حدیث سے جاسوسی کے جواز پر استدلال کیا ہے، تمام شراح حدیث نے بھی یہی لکھا ہے کہ جاسوسی کرنا جائز ہے۔(۱)

اس حدیث سے کچھ باتیں معلوم ہوئیں کہ جاسوسی میں اگر دھمکی کی ضرورت ہو، تو دھمکی دی جاسکتی ہے، حتیٰ کہ اگر قرائن سے معلوم ہو، تو مارا بھی جاسکتا ہے، تلاشی بھی لی جاسکتی ہے، حتیٰ اگر ننگا کرنے کی ضرورت ہو، تو ننگا بھی کیا جاسکتا ہے۔

محکمہ ڈاک کی ملازمت:

محکمہ ڈاک کی ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے، کیونکہ اس میں بظاہر کوئی خلافِ شرع کام نہیں کرنا پڑتا، جس کی وجہ سے اس کو ناجائز کہا جاسکے، بلکہ محکمہ ڈاک ہر دور کے لوگوں کی اہم ضرورت رہی ہے اور آج بھی اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس لئے محکمہ ڈاک کی ملازمت میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، حتیٰ کہ کفار کے ممالک میں بھی اس محکمے میں ملازمت کرنا جائز ہے۔

کفایت المفتی میں ہے:

"سوال: چھٹی رسانی کی نوکری حکومت برطانیہ کی کرنا جائز ہے، یا نہیں؟

جواب: چھٹی رسانی کی ملازمت کرنا مباح ہے"۔(۲)

(۱) بخاری شریف، کتاب المغازی، باب من شهد بدرا

(۲) کفایت المفتی: ۷ / ۳۴۱ ۔ دار الاشاعت کراچی

اسٹامپ انسپکٹر کی ملازمت جائز ہے:

سوال:

انسپکٹر کے فرائض یہ ہیں کہ صوبہ بھر میں دورہ کرنا ہوگا، اور ہر عدالت، دیوانی و کلکٹری وسرکاری دفاتر کا معائنہ کرنا ہوگا کہ مقدمات دیوانی اور مالی میں اور درخواستوں پر سرکاری رسوم یا فیس کافی ادا کی گئی ہے یا کم ہے؟ اگر کم ہے تو رپورٹ کرنا ہوگا کہ عدالت یا دفتر متعلقہ فریق سے وصول کرے۔

جواب:

یہ حقیقت میں اعانت ہے اسٹامپ کی اور جواز وعدم جواز میں اس کے تابع ہے، اب قابل تحقیق اسٹامپ کا حکم ہے، سوغور کرنے سے اس میں گنجائش کی توجیہ ہوسکتی ہے کہ مقدمات کے فیصلہ وغیرہ میں جو عملہ خرچ ہوتا ہے، وہ اہل مقدمہ سے بعوض عمل کے جن کا نفع اہل مقدمہ کو پہنچتا ہے وصول کر کے عملہ کی تنخواہ وغیرہ میں صرف ہوتا ہے، گویا اسٹامپ کی قیمت جو احد الفریقین سے وصول کی جاتی ہے وہ معاوضہ واجرت ہے، اس کام کی جو عدالت بواسطہ عملہ کے اس فریق کا کام کرتی ہے، پھر عدالت عملہ کو اس کام کا عوض واجرت دیتی ہے جو عملہ سے کام لیتی ہے، جیسے منی آرڈر کی فیس، یا ٹکٹ کی قیمت کہ ڈاکخانہ اپنی خدمت کی اجرت لیتا ہے، پھر عملہ کو ان کی اجرت دیتا ہے، اس توجیہ سے جب اسٹامپ میں جواز کی گنجائش ہے، تو اسٹامپ کی انسپکٹری میں بھی اسی طرح گنجائش ہے اور ہر حال میں منصفی سے غنیمت ہے۔(۱)

---

(۱) امداد الفتاویٰ: ۳/ ۴۰۷

ایسی ملازمت جس میں جاندار کی تصویر کشی ہو:

اگر کوئی شخص کسی ایسی جگہ ملازم ہو جہاں وہ تصویر کشی کرتا ہو، تو چونکہ تصویر بنانا اور بنوانا اسلام میں ناجائز اور حرام ہے، اس لئے ایسی جگہ ملازمت کرنا بھی جائز نہیں، جب ملازم کے ذمے تصویر کھینچنا ہو، تو ایسی ملازمت جائز نہیں ہے۔

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے:

''سوال: (۱۶۵) زید ایسی ملازمت کرسکتا ہے؟ جس میں اس کو تصویر جاندار وغیر جاندار کی کھینچنی ہو؟۔

الجواب: جس ملازمت میں تصویر کشی جاندار کی ملازم کے ذمے ہو، خواہ خود کھینچے یا کسی سے کھینچوائے، وہ ملازمت درست نہیں ہے''۔(۱)

پاسپورٹ اور کارڈ کی تصویر کھینچنے کا حکم:

ضرورت کی وجہ سے فقہاء کرامؒ نے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کی تصویر بنانے کی اجازت دی ہے، لہٰذا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کے لئے تصویر بنانے والے ادارے یا دوکان میں ملازمت کرنا جائز ہے۔

جعلی حکیم وڈاکٹر کے ساتھ ملازمت کرنا:

جعلی حکیم یا جعلی ڈاکٹر جو باقاعدہ ڈاکٹر یا حکیم نہ ہو، اس کو چونکہ علاج کرنے کی اجازت نہیں ہے، اس لئے ایسے حکیم اور ڈاکٹر کے پاس ملازمت کرنا بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ ایک ناجائز کام میں دوسرے کی مدد وتعاون کرنا ہے، جو شرعاً جائز نہیں ہے:

---

(۱) فتاویٰ دار العلوم دیوبند:۱۵/ ۳۳۰

﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾(۱)

یہ چونکہ معصیت پر تعاون ہے اس لئے ایسی ملازمت شرعا درست نہیں ہے۔

مسلمان ڈاکٹر کا غیر مسلم این جی او فلاحی ہسپتال میں ملازمت کرنا:

مسلمان ڈاکٹر کے لئے غیر مسلموں کے ادارہ یا ملک میں ملازمت کرنے کا حکم یہ ہے کہ

(۱) غیر مسلم ممالک میں ملازمت درست ہے، خواہ وہ سرکاری ہو، یا غیر سرکاری۔

(۲) غیر مسلم ادارہ یا این جی او میں ملازمت کے بارے میں تفصیل ہے، اس کی دو صورتیں ہیں:

۱)......اگر وہ این جی او محض فلاحی کام کرتا ہو، اپنے مذہب کی تبلیغ وترویج اور اسلام دشمنی میں ملوث نہیں ہے، تو اس میں بھی ملازمت صحیح ہے۔

۲)......اگر وہ این جی او فلاحی کاموں کی آڑ میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتا ہے اور اسلام دشمنی میں سرگرم ہے، تو اس میں ملازمت صحیح نہیں ہے، ایسے ادارے میں ملازمت کرنا غیرتِ ایمانی کے بھی خلاف ہے، اس طرح کے ادارے ہمارے یہاں دو قسم کے ہیں:

۱)......عیسائیوں کے این جی اوز۔

۲)......آغا خانیوں کا ادارہ آغا خان فاؤنڈیشن۔

ان لوگوں نے این جی او، فلاحی ہسپتال، ڈسپنسریاں، سکول اور کالج وغیرہ قائم کئے ہوئے ہیں، ان کو بیرونی ممالک سے فنڈ ملتے ہیں، بظاہر تو یہ فلاحی ادارے ہیں، لیکن حقیقت میں ان لوگوں کے اپنے مذموم عزائم ہیں، جن کو پورا کرنے کے لئے یہ لوگ مسلمانوں پر اتنے مہربان ہیں، یہ لوگ مسلمانوں کو مرتد بنا رہے ہیں، ملک اور ملت کے خلاف مختلف قسم کی سازشیں کر کے ملک کو کمزور کرنے کی مذموم کوشش کر رہے ہیں، اس لئے ایسے اداروں میں ملازمت کرنا جائز نہیں ہے، اس سے بچنا لازم ہے۔

---

(۱) سورۃ مائدہ، آیت: ۲.

جدید مسائل کا حل میں ہے:

''اگر کوئی شخص ان اداروں میں بحیثیت ڈاکٹر ملازمت کرتا ہے اور اس کا کام صرف مریضوں کا علاج کرنا ہے، تو اس کی یہ ملازمت فی نفسہٖ جائز ہے، اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حلال ہے، لیکن اگر یہ ادارے والے اپنے ہسپتال میں بلا واسطہ طور پر عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہیں، اس صورت میں مذکورہ ڈاکٹر کے لئے یہاں ملازمت کرنا بہتر نہیں ہے، کیونکہ اس میں ایک طرح سے ان سے تعاون ہے، اس لئے چاہئے کہ دوسری مناسب ملازمت تلاش کرے اور جیسے ہی کوئی مناسب ملازمت مل جائے، تو یہ ملازمت چھوڑ دے''۔(۱)

سرکاری اسکول وغیرہ میں استاذ بن کر ملازمت کرنا

سرکاری اسکول، کالج، یونیورسٹی میں بحیثیت استاذ، پروفیسر یا لیکچرار بن کر ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ اس کے ذمے وہ مضامین پڑھانا ہو جو شرعاً جائز ہیں، جن مضامین کی تعلیم جائز نہیں، جیسے جنسی تعلیم کے مضامین یا موسیقی کی کلاس لینا، ان کا استاذ بن کر ان کو پڑھانا بھی جائز نہیں ہے اور اس پر حاصل ہونے والی تنخواہ بھی حلال نہیں ہے۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

''سوال: نمبر ۹۱۱۴: سرکاری اسکولوں میں بحیثیت استاذ کام کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز تنخواہ حلال ہے، یا مشتبہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً: اگر وہاں غلط عقائد، غلط اخلاق، غلط اعمال کی تعلیم نہیں دی جاتی، بلکہ کوئی غلط بات آجاتی ہو، تو اس کی تردید کردی جاتی ہے، تو وہاں

(۱) جدید مسائل کا حل ص٥٠٦ ۔ ادارہ تالیفات اشرفیہ

ملازمت کرنا، اجرت وتنخواہ لینا درست ہے"۔(۱)

شوہر کا بیوی کی نوکری کرنا:

شوہر کی حیثیت ایک حاکم کی ہے، وہ گھر کا سربراہ ہے، جو کام اس کے ذمے لازم ہیں، وہ تو ہر حال میں کرے، باقی اگر شوہر اپنی عورت کی ملازمت اختیار کرے، یا اُس کی نوکری کرے، تو شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں شوہر کی تذلیل واہانت ہے اور اس میں قلبِ موضوع ہے، یعنی شوہر کی حیثیت مخدوم کی ہے، وہ خادم بن کر رہ جائے گا۔

ایسی جگہ ملازمت جہاں اجنبی بے پردہ عورتوں سے میل جول ہو

ایسی جگہ نوکری کرنا جہاں پر ہر وقت اجنبی عورتوں یا لڑکیوں سے بے پردہ میل جول کی نوبت آتی ہو، درست نہیں ہے، انتہائی خطرے کی بات ہے، جہاں تک ہوسکے ایسی نوکری کو چھوڑ دیا جائے اور کوئی ایسی نوکری تلاش کی جائے، جہاں کم از کم ایمان سلامت رہے، اگرچہ نفس کام جائز ہو، تب بھی ایسی ملازمت یا نوکری مناسب نہیں ہے۔

ایسی کمپنی میں ملازمت جو بینک سے سود پر قرض لے:

آج کل اکثر کمپنیاں اپنا کاروبار بڑھانے کے لئے سود پر قرضہ لیتی ہیں، تو اگر کوئی کمپنی جائز کاروبار کے لئے قرض لیتی ہے، تو شرعاً اس کی گنجائش ہے، البتہ سودی قرض لینا اور اس پر سود ادا کرنا جائز نہیں ہے، حرام ہے، اگر کمپنی کا کاروبار جائز ہے، تو ایسی کمپنی میں ملازمت کرنا جائز ہے، سود دینے سے اصل مال میں حرمت نہیں آتی، اس لئے ملازمت جائز تو ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ ملازم کا کام سودی لین دین اور لکھت پڑھت سے نہ ہو۔

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ: ۲۵ / ۱۱۵ ۔ دار الاشاعت کراچی

چنگی کی ملازمت اور اس کی آمدنی کا حکم:

سوال: چنگی: اس محکمے کا کام یہ ہے کہ جو مال باہر سے تاجر لوگ لائیں، ان سے مقرر سرکار محصول لیا جائے، محرر (تحریر کرنے والا) تخمینہ (اندازہ) کر کے محصول لگا کر وصول کرتے ہیں، سپرنٹنڈنٹ جانچتا ہے، سیکرٹری بعض اوقات جانچتا بھی ہے اور احکامات جاری کرتا ہے، چپراسیان تجار وغیرہ کو محصول کے لئے روکتے ہیں، وہ اسباب تولتے ہیں جن پر محصول لگایا جائے گا، محصول کا روپیہ صدر کو لیجاتے ہیں، غرض اس محکمے کے سب لوگ محصول کے متعلق کوئی نہ کوئی کام کرتے ہیں، آیا اس محکمہ میں کسی قسم کی ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جو قواعد شریعت نے اموال پر محصول لینے کے لئے مقرر فرمائے ہیں، جن کو فقہاء نے باب العشر میں ضبط کیا ہے، چونکہ محکمہ مذکور کے قواعد ان پر منطبق نہیں ہیں، اسلئے بوجہ خلاف ما انزل اللہ ہونے کے غیر مشروع ہو گئے ہیں، اور حسب ارشاد الٰہی

﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (۱)

اس کی اعانت بھی معصیت ہوئی، لہٰذا محکمہ مذکور کی ملازمت ناجائز ہے، مگر جو تنخواہ ملتی ہے وہ بوجہ اس کے کہ حاکم غیر مومن کا استیلاء اموال پر موجب تملیک ہو جاتا ہے، اور حاکم غیر مومن جو مال برضائے خود کسی مومن کو دیں خواہ کسی عنوان سے ہو وہ مباح ہے، اس لئے وہ تنخواہ حلال ہے، غرض خدمت غیر مشروع اور من وجہ مشروع ہے، پس عامل کو صرف عمل کا گناہ ہوگا، اور غیر

(۱) سورۃ المائدۃ، آیت: ۲

عامل جو اس تنخواہ سے منتفع ہو، مثلاً اس کے اہل وعیال یا اضیاف واحباب ان کو کوئی گناہ نہ ہوگا۔(۱)

سودی کاروبار کرنے والے مالیاتی کی ملازمت اور آمدنی کا حکم:

سوال: میں ایک مالیاتی ادارے میں کام کر رہا ہوں، جہاں سودی کاروبار ہے، یعنی بعض کمپنیوں کو سود پر اور بعض کو نفع ونقصان پر قرضے دیتے ہیں، اور نفع بھی اس طرح ہے کہ فیصد فکسڈ ہے یعنی پندرہ فیصد سال میں، اور اگر نقصان ہو جائے تو بھی پانچ فیصد، بلکہ نقصان کی صورت میں بھی اس کو منافع ہوتا ہے، کیونکہ پندرہ فیصد جو منافع کا حصہ ہے، اس کے برابر کمپنی کے سرٹیفکیٹس یعنی حصص لے لیتی ہے، اس کے علاوہ سودی کاغذات بھی لکھنے پڑتے ہیں، کہ آپ کے ذمے اتنا سود ہے، اسے ادا کرو اور سود کی جانچ پڑتال کرنی پڑتی ہے، بعض اوقات جسے قرضے دیتے ہیں، اس کے لئے کمپنی کا معائنہ بھی کیا جاتا ہے، اب آپ سے درخواست ہے کہ شرع کی رو سے جواب دیں کہ اس میں نوکری جائز ہے یا بالکل ناجائز؟ یا اور کوئی صورت حال ہے؟ اور اس میں میرا شمار سودی کاتبین میں ہوگا یا نہیں، اور یہ میرے اوپر کتنا گناہ ہے اور یہ جو سود کرتے ہیں جو اسلام نے بیان کیا وہ ہے یا نہیں؟

جواب: ادارے کی جو تفصیلات آپ نے لکھی ہیں اگر وہ درست ہیں، اور ادارے کی اکثر آمدنی سود یا دوسرے ناجائز ذرائع پر مشتمل ہے، یا اس ادارے میں آپ کو سود کے معاملات کا حساب وکتاب وغیرہ کرنا پڑتا ہے، تو

---

(۱) امداد الفتاوی: ۳/ ۳۹۶

اس میں ملازمت شرعا جائز نہیں، ایسی صورت میں آپ کو چاہئے کہ دوسرے حلال روزگار کو تلاش کریں، اور اس کے ملنے پر یہاں سے علیحدہ ہوجائیں، جب تک دوسرا روزگار مہیا نہ ہو، اس وقت تک موجودہ ملازمت کو ناجائز سمجھتے ہوئے اس پر استغفار کرتے رہیں اور جلد از جلد حلال روزگار حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں۔(۱)

ملازمت سے برطرفی کے زمانے کی تنخواہ کا حکم:

سوال: محترم ومکرم جناب مفتی صاحب دامت برکاتہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، عرض ہے کہ درج ذیل مسئلے کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں مطلوب ہے، زید پاکستان ایئرفورس کی ایک شاخ (جو بین الاقوامی جہازوں پر کام کرتی ہے) کے شعبہ ''انجرینگ'' کے ایک اہم عہدے پر مستقل ملازم تھا، ادارے نے اس کو چار سال قبل ملازمت سے برطرف کردیا کہ تمہاری وجہ سے دو جہازوں پر کام پندرہ بیس منٹ تاخیر سے ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس غلطی کے ذمہ دار کچھ اور لوگ تھے، زید اس ادارے کا ایک مستند، دیانتدار اور محنتی ومستقل ملازم تھا۔ خیر۔ مقدمہ عدالتوں میں چلا، اور تین سال بعد ایک عدالت کے پرانے جج نے فیصلہ دیا کہ اس کو کیوں نکالا گیا یہ ایک الگ بات ہے (یہ زیر غور نہیں، نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کی گئی) اس کو نکالنے کا جو قانونی طریقہ تھا وہ اختیار نہیں کیا گیا، اس لئے اس کو فوراً ملازمت پر بحال کیا جائے اور اس کے پچھلے تمام واجبات ادا کئے جائیں، لیکن عدالت کے حکم کو نہ

(۱) فتاوی عثمانی :۳ / ۳۹۳

مانتے ہوئے ادارے نے ''مقدمہ'' عدالت عالیہ میں داخل کر دیا، اور درخواست کی اگر اس میں کوئی قانونی سقم ہو تو فیصلہ کیا جائے۔ عدالت عالیہ کے سب سے بڑے جج نے حکم دیا کہ تمام واجبات ادا کرو، جب فیصلہ ہوگا اس وقت اگر زید ہار گیا تو سب رقم واپس کر دے گا، اور اگر مقدمہ جیت گیا تو ملازمت بحال اور سب رقم اس کی۔

اب زید کے رقم وصول کرنے کا وقت ہے یعنی ماہانہ تنخواہ اور پچھلے واجبات، لیکن وہ کہتا ہے کہ میں نے چار سال تک نہ ان کا کام کیا اور نہ انہوں نے مجھے کچھ کہا، اور ہر ماہ کی بغیر کام کیئے جو تنخواہ ملے گی، آیا اس رقم کا وصول کرنا میرے لئے جائز ہے یا حرام؟ اور مقدمہ جیتنے کی صورت میں وہاں دوبارہ ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

ادارہ حکومت کا ہے ہر شخص اس کا ملازم ہے، یہ شاخ ایئر فورس کے چھوٹے، بڑے ملازمین کے پیسوں سے قائم ہوئی تھی، اس کا فائدہ خود انہیں اور ایئر فورس کو جاتا ہے، زید اس کا صرف ملازم تھا یہ ادارہ کسی کا ذاتی نہیں، یہاں ملازم رکھنے اور نکالنے کا طریقہ شرعی نہیں، جو قوانین موجودہ ہمارے ملک کے اداروں، عدالتوں وغیرہ میں چل رہے ہیں، اسی کے مطابق یہ کاروائی ہوئی ہے اور ہوگی۔

زید کا کہنا ہے کہ اگر میرے لئے یہ رقم اور ملازمت پر دوبارہ جانا جائز نہیں، بلکہ حرام ہے، تو میں اس کو حاصل نہیں کروں گا۔

سوال ۲: بالکل اسی طرح کا ایک اور مقدمہ ہے کہ اس شخص نے عدالت کے ایک اہم اہلکار کو قلیل سی رقم دے کر یعنی بطور رشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ

کروالیا، اور اب تنخواہ بغیر کام کیئے کے لے رہا ہے، اس میں شک نہیں کہ یہ شخص بھی حق پر تھا، اور اپنا جائز کام کرانے کے لئے رشوت دی تھی، بصورت دیگر اس کے خلاف بھی فیصلہ ہوسکتا تھا، اب اس کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب نمبرا: حکومت کے جس قانون کے تحت سرکاری ملازمین (فوجی ہوں یا سول) کا تقرر، تنزل، یا معزولی وغیرہ عمل میں آتے ہیں، اس قانون کے نافذ ہو جانے کے بعد وہ قانون فریقین کے معاہدہ ملازمت کا حصہ بن جاتا ہے، اور اس پر وہی احکام جاری ہوتے ہیں جو معاہدہ اجارہ کی شرائط پر ہوسکتے ہیں، چنانچہ اس قانون کی خلاف ورزی شرائط معاہدہ کی خلاف ورزی سمجھ جائے گی، اب اگر کسی سرکاری ادارے نے ان شرائط یا قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی ملازم کو معزول کیا، جب کہ قانون میں یہ بھی ہو کہ ایسی معزولی قانونا معتبر نہ ہوگی، تو یہ معزولی شرائط معاہدہ کے خلاف ہونے کی بناء پر شرعا بھی درست نہ ہوئی اور زید بدستور ملازمت پر برقرار رہا، اور اس کا اس فیصلے کو عدالت میں چیلنج کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی خدمات ادارے کو پیش کرنے کے لئے پوری طرح آمادہ اور تیار تھا، اس لئے اس کا کام نہ کرنا اس کی غلطی کی وجہ سے نہیں، بلکہ ادارے کی غلطی کی وجہ سے ہوا، جس نے اس سے کام نہیں لیا، لہٰذا اگر عدالت اسے اس زمانے کی تنخواہ بھی دلواتی ہے، تو مندرجہ بالا وجہ کی بناء پر اس کے لئے اس کا لینا جائز ہے۔ تاہم اگر وہ احتیاط پر عمل کرتے ہوئے اس زمانے کی تنخواہ نہ لے، تو یہ تقویٰ کی بات ہے جو انشاء اللہ موجب اجر ہوگی۔

جواب ۲: اس ملازم کو رشوت دینا ہرگز جائز نہیں تھا، اس نے رشوت دے کر

سخت حرام کا ارتکاب کیا، اور اگر رشوت کے ذریعے ناحق فیصلہ کرایا، تو گناہ بھی دگنا ہے، اور یہ رقم لینا بھی حلال نہیں، لیکن اگر فیصلہ جواب نمبر ا کی تفصیل کے مطابق شرعا درست ہو، تو رشوت کے گناہ کے باوجود کام نہ کرنے کے زمانے کی تنخواہ لینے اور اسے استعمال میں لانے کی گنجائش ہے، جس کی وجہ جواب نمبر (ا) میں لکھی جا چکی ہے۔(۱)

ملازم کی اجرت سے اس کے لئے تجارت جائز ہے

سوال۔۳۹۲: کیا فرماتے ہیں مفتیان دین اس مسئلہ میں کہ ایک تاجر نے اپنے کسی ملازم کی تنخواہ نہیں دی، ملازم تقاضا کرتا رہا، مگر مالک نے انکار کیا، اس کے بعد مالک نے اس کی تنخواہ کی رقم اگر کسی کاروبار میں لگا دی، اور نیت کی کہ کاروبار میں جو نفع آئے گا، وہ اصل کے ساتھ ملازم کو دے دیں گے، اس طرح تاجر کے لئے ملازم کی رقم سے کاروبار کرنا، اور ملازم کے لئے زائد رقوم کا لینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب باسمہ تعالیٰ: صورت مسئولہ میں تاجر کے لئے ملازم کی اجرت بلا وجہ روکنا ناجائز اور حرام ہے، اس وجہ سے اس کو جو ایذاء پہنچائی جائے گی، وہ بھی گناہ اور حرام ہے، البتہ بعد میں اس نے جو اس کی اجرت کی رقم سے کاروبار کیا اور اس کے منافع کو اس کیلئے محفوظ رکھا ہے، یہ اچھی بات ہے، اس طرح کاروبار بھی از روئے قرآن وحدیث جائز ہے اور ملازم کے لئے ان رقوم کا لینا (اصل مع المنافع) جائز اور حلال ہے:

---

(۱) فتاویٰ عثمانی: ۳ / ۴۱۰

"أخرج البخاري هذا الحديث بطوله ......وفيه ......وقال الثالث أللهم استاجرت أجيرا ! ، فأعطيتهم أجرهم ، غير رجل واحد ترك الذي له وذهب ، فشهرت أجره حتىٰ كثرت منه الأموال ،فجائتني بعد حين ، فقال يا عبد الله! أد إلى أجري ، فقلت له :كل ما ترىٰ من أجرك من الإبل والبقر ،والغنم ، و الرقيق ـ فقال يا عبد الله ! لا تستهزئ بي ، فقلت إني لا أستهزء بك ، فأخذه كله ، فاستاقه ،فلم يترك منه شيئا "ـ(۱)

بخاری شریف کے اندر حدیث الغار کے نام سے ایک لمبی حدیث ہے، مذکورہ بالا عبارت اس حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جس میں ایک صاحب نے (یعنی مستاجر نے کسی مصیبت میں پھنس جانے کے بعد اپنے نیک اعمال کے سہارے سے جب دربار خداوندی میں دعا مانگی، تو اپنے اس عمل خیر کو وسیلہ بناتے ہوئے یہ عرض کیا) اے اللہ! میں نے کچھ ملازمین کو کام کے لیئے رکھا تھا سوائے ایک شخص کے سب کی مزدوری میں نے دے دی۔جس آدمی کی مزدوری روک لی گئی تھی، اس مزدوری کے پیسے کو میں نے کاروبار میں لگایا، اس میں بہت نفع ہوا، کچھ عرصے کے بعد جب وہ ملازم تنخواہ مانگنے آیا، تو میں نے اس کی اجرت کی رقم سے حاصل شدہ مال کی طرف اشارہ کیا، اور کہا کہ جو کچھ تمہیں نظر آرہا ہے، یہ سب تمہارے اموال ہیں، اس نے کہا بھائی مذاق مت کرو، میری مزدوری کی رقم دے دو، میں نے جب سب باتیں تفصیل سے اسے بتادیں، کہ میں نے تمہاری اجرت کی رقم سے کاروبار کیا، اس سے یہ

(۱)صحیح البخاری ، باب من استاجر اجیرا فترکه اجره ...... الخ

منافع حاصل ہوئے، تو وہ خوش ہو کر سب لے گیا اور کچھ نہیں چھوڑا اور یہ میں نے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے واسطے کیا ہے، اے اللہ! اگر تجھے یہ کام پسند ہے، تو اس کی برکت سے ہمارے غار کے منہ سے پتھر کو ہٹا دے، تو پتھر کا بقیہ حصہ ہٹ گیا اور غار کا منہ کھل گیا، جس کے بعد ہم لوگ غار سے نکل گئے۔(۱)

---

(۱) آپ کے سوالات اور ان کا حل: ۲/ ۱۵۴

باب......(۸)

ملازم اور رشوت

رشوت کی تعریف:

القاموس الفقہی میں رشوت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"عند الحنفيه وغيرهم : مايعطى لإبطال حق أو لإحقاق باطل"۔(۱)

ترجمہ: جو چیز (مال وغیرہ) کسی حق کو ناحق ثابت کرنے کے لئے یا ناحق کو حق ثابت کرنے کے لئے دی جائے (اس کو رشوت کہتے ہیں)

تفسیر معارف القرآن میں البحر المحیط کے حوالے سے رشوت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"أخذ الأموال على فعل ما يجب على الآخذ فعله أو فعل مايجب عليه تركه"۔(۲)

جس کام کا کرنا کسی کے ذمے واجب ہے، اس کے کرنے پر معاوضہ لینا یا جس کام کا چھوڑنا کسی کے ذمے لازم ہے، اس کے کرنے پر معاوضہ لینا، رشوت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں رشوت کو "سحت" قرار دیا ہے، رشوت کو "سحت"

---

(۱) القاموس الفقھی: ص ۱۴۹

(۲) معارف القرآن: ۵/ ۳۹۷

کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف لینے دینے والوں کو برباد کرتی ہے، بلکہ پورے ملک وملت کی جڑ، بنیاد اور امن عامہ کو تباہ کرنے والی ہے، جس ملک یا جس محکمہ میں رشوت چل جائے، وہاں قانون معطل ہو کر رہ جاتا ہے، اور قانونِ ملک ہی وہ چیز ہے جس سے ملک وملت کا امن برقرار رکھا جاتا ہے، وہ معطل ہو گیا، تو نہ کسی کی جان محفوظ رہتی ہے، نہ آبرو، نہ مال۔ اس لئے شریعت اسلام میں اس کو ''سحت'' فرما کر اشد حرام قرار دیا ہے اور اس کے دروازے کو بند کرنے کے لئے امراء وحکام کو جو ہدایا اور تحفے پیش کیے جاتے ہیں، ان کو بھی صحیح حدیث میں رشوت قرار دے کر حرام قرار دیا گیا ہے۔(۱)

رشوت کے بارے میں وعید:

حدیث نمبر۱:

"وعن عبد الله بن عمرو قال : لعن رسول الله ﷺ الراشی و المرتشی"۔(۲)

ترجمہ: عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے اور لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔

حدیث نمبر۲:

"وعنه عن النبی ﷺ قال : الراشی والمرتشی فی النار"۔(۳)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ آپ ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ

---

(۱) معارف القرآن: ۳ / ۱۵۱

(۲) مسند احمد بن حنبلؒ جلد ۲ ص ۳۴۹، رقم الحدیث ٦٤٩٦

(۳) مجمع الزوائد: ٤ / ۳۵۹ ۔ دار الفکر بیروت

رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔

حدیث نمبر ۳:

"وعن ثوبان رضی اللہ عنہ : قال لعن رسول اللہ ﷺ و المرتشی والرائش یعنی الذی یمشی بینھما"۔(۱)

ترجمہ: حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے رشوت دینے والے پر، رشوت لینے والے پر، اور ان کے درمیان واسطہ بننے والے پر۔

رشوت دے کر نوکری یا ملازمت حاصل کرنے والے کی تنخواہ کا حکم:

رشوت کا لینا اور دینا دونوں گناہ ہے، انتہائی بڑا جرم ہے، احادیث میں رشوت لینے والے اور دینے والے دونوں کے لئے سخت قسم کی وعیدیں وارد ہوئی ہیں، سفارش اگر جائز کام کیلئے ہو تو جائز ہے، جب کہ اس کا طریقہ بھی جائز ہو، یعنی دباؤ اور اجبار نہ ہو، تو سفارش کرا کر نوکری حاصل کرنا بھی جائز ہے اور اس سے حاصل ہونے والی تنخواہ بھی حلال ہے۔

اور رشوت دے کر نوکری یا ملازمت حاصل کرنا ناجائز ہے اور کمائی کے بارے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر ملازمت کی استعداد اور صلاحیت موجود ہے، یعنی اس ملازمت کا اہل ہے اور جو کام اس کے سپرد کیا گیا ہے، اسے ٹھیک ٹھیک انجام دیتا ہے، تو اس کی تنخواہ حلال ہے اور اگر وہ اس کام کا اہل نہیں ہے اور اس میں اس کام کی استعداد موجود نہیں ہے، تو اس ملازمت کی تنخواہ بھی حلال نہیں ہے۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

"اگر ملازمت کا کام جائز ہے، تو اس ملازمت کی آمدنی تنخواہ بھی جائز ہے،

---

(۱) مسند احمد بن حنبل : ۶/ ۳۷۶ ۔ رقم الحدیث : ۲۱۸۹۳

ابتداءً اگر ملازمت حاصل کرنے کے لئے رشوت دی، تو اس کی وجہ سے ملازمت کی آمدنی جو کہ درحقیقت خدمت ومحنت کا معاوضہ ہے ناجائز نہیں، رشوت کا گناہ اس کی آمدنی تک نہیں پہنچتا"۔(۱)

ملازمت برقرار رکھنے کے لئے رشوت دینا:

بعض لوگ کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ میں اس کے قواعد وضوابط کے مطابق نوکری حاصل کر لیتے ہیں، لیکن دوران ملازمت آفسران بالا بعض ناجائز وجوہات کی بناء پر تنگ کرتے ہیں اور ملازمت سے نکالنے کی دھمکیاں دیتے ہیں اور رشوت طلب کرتے ہیں، جبکہ ملازم کے لئے اس ملازمت کے علاوہ اور کوئی جائز ذریعہ معاش بھی نہ ہو، تو ایسی مجبوری کی حالت میں ملازمت برقرار رکھنے کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے، لیکن ملازم اس پر استغفار کرے، تاہم حکام کے لئے یہ رشوت ہے اور ان کے لئے اس کا لینا حرام ہے، نیز حکام بالا کے لئے ماتحت ملازم کو بلاوجہ تنگ کرنا اور پریشان کرنا ملازمت سے فارغ کرنے کی دھمکی دینا، رشوت طلب کرنا یہ سب امور ناجائز اور حرام ہیں، اس لئے حکام کو ایسی ناجائز باتوں سے بچنا چاہئے۔

اجیر خاص میں پائی جانے والی شرعی خرابیاں:

۱۔ ملازمین کا آمد ورفت کے مقررہ اوقات کی پابندی نہ کرنا یعنی دیر سے آنا اور جلدی چلے جانا۔

۲۔ بعض ملازمین وقت مقررہ پر حاضر تو ہوتے ہیں، لیکن حاضری لگوانے کے بعد چلے جاتے ہیں، یہ بھی خیانت ہے۔

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ: ۲۵ / ۱۵۲ ۔دار الاشاعت کراچی

۳۔ بعض ملازمین جلدی جلدی مقررہ کام پورا کر کے، یا تو گھر چلے جاتے ہیں، یا کسی دوسری جگہ ملازمت کے لئے چلے جاتے ہیں، حالانکہ ان کا مقررہ وقت ابھی باقی ہوتا ہے، جس میں حاضر رہنا شرعاً ضروری ہوتا ہے۔

۴۔ بعض ملازمین کام کے ہوتے ہوئے بھی کوتاہی کرتے ہیں اور اپنا کام نہیں کرتے، بلکہ فضول وقت ضائع کرتے رہتے ہیں، مثلاً موبائل یا فون پر بات شروع کی، یا موبائل میں دیکھنا شروع کر دیا، اور اسی میں کافی دیر تک لگے رہتے ہیں، اپنے کام کی طرف توجہ نہیں ہوتی، نیز بعض ملازمین کے کام کا کئی دوسرے افراد کے ساتھ بھی تعلق ہوتا ہے کہ جب یہ کام دے گا، تو آگے کام ہوگا، ورنہ نہیں ہوگا، تو ایسے لوگ اپنا بھی وقت ضائع کرتے ہیں اور دوسروں کا وقت بھی ضائع کرتے ہیں۔

۵۔ بعض ملازمین اپنی جگہ کسی اور کو بھجوا کر گھر بیٹھے تنخواہ وصول کرتے رہتے ہیں، حالانکہ ادارے کے قانون میں اس کی اجازت نہیں ہوتی، اور شرعاً بھی اس کی اجازت نہیں ہے بغیر کام کئے تنخواہ کس چیز کی لے رہا ہے؟

۶۔ بعض ملازمین اپنے تعلقات کی وجہ سے حاضری لگوا کر خود حاضر نہیں ہوتے اور تنخواہ وصول کرتے رہتے ہیں، جیسے اکثر گاؤں دیہات کے سرکاری اسکولوں کے اساتذہ کرتے ہیں۔

۷۔ کثر ملازمین ادارے کی طرف سے دیئے گئے درمیانی وقفے میں مقررہ وقت سے زیادہ وقت لگاتے ہیں، مثلاً ادارے کی طرف سے کھانے یا چائے پینے یا نماز کا مخصوص وقفہ دیا جاتا ہے، تو ملازمین اس میں مقررہ وقت سے زیادہ وقت گزارتے ہیں، یہ بھی ناجائز ہے۔

۸۔ بعض تعلیمی اداروں میں اساتذہ بغیر رخصت لئے امتحانات کے زمانے میں مقررہ اوقات میں حاضر نہیں ہوتے، امتحانات کے ایام میں بھی حاضر ہونا لازمی ہے۔

ایسی صورتوں میں ان ملازمین کے لئے ایام غیر حاضری اور بقدر کوتاہی اوقات کی

اجرت لینا ناجائز اور حرام ہے اور جو لے چکے ہیں وہ رقم متعلقہ ادارے کو واپس کرنا واجب ہے۔

رشوت ایک ناسور ہے

آج کل عہدے اور مناصب باعثِ اعزاز اور ذرائع کسب سمجھے جاتے ہیں، لیکن در اصل عہدیداروں اور ذمہ داروں کی جواب دہی عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے اور وہ اپنے بارے میں بھی جواب دہ ہوتا ہے، اور اپنے ماتحتوں کے بارے میں بھی، اس لئے جو لوگ اعلیٰ عہدہ اور منصب پر فائز ہیں ان کو زیادہ محتاط اور دامن عمل زیادہ پاک وصاف ہونا چاہئے، حضور ﷺ نے سرکاری ملازمین کو دیئے جانے والے تحفے اور ہدیہ کو حرام قرار دیا ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" هدايا العمال غلول "۔(۱)

اسی بناء پر فقہاء نے صراحت کی ہے کہ جو شخص قاضی بنایا جائے، یا کسی اور سرکاری عہدہ پر فائز کیا جائے، تو اسے ایسے لوگوں سے تحفہ قبول کرنا جائز نہیں، جو اس سے پہلے اسے تحائف پیش نہیں کیا کرتے تھے، یا پہلے کم یا معمولی تحفے دیتے تھے، اور اب تحائف کی مقدار اور معیار میں اضافہ ہو گیا ہو، کیونکہ تحفہ اپنے مقصد ومنشاء کے اعتبار سے رشوت ہوا کرتا ہے، اور اس طرح خوبصورت ناموں کا غلاف چڑھا کر ایک ناپاک اور خبیث شی کا لین دین عمل میں آتا ہے، رسول اللہ ﷺ جو بحیثیت پیغمبر، انسانی نفسیات سے سب سے زیادہ باخبر اور حقیقت سے آگاہ تھے، آپ ﷺ نے نہایت وقعت نظر سے اس چھپی ہوئی انسانی بیماری کو شناخت فرمایا، اور اس کے سد باب کے لئے یہ علاج تجویز کیا کہ سرکاری عہدیدار رہتے ہوئے لوگ اسے جو کچھ دیں وہ اسے بیت المال میں داخل کر دے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ابن امیہ نامی قبیلہ بنو اسد کے ایک شخص کو وصولی زکوۃ پر

---

(۱) مجمع الزوائد:(٤ / ٢٠٠)

عامل بنایا، جب وہ صاحب واپس آئے اور عرض کیا کہ یہ آپ ﷺ کا ہے اور یہ لوگوں نے مجھے ہدیہ کیا ہے، "ھذا لکم و ھذا أھدی لی"، آپ ﷺ کو اس سے بہت ناگواری ہوئی، حضور ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے اور لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم جب کسی شخص کو عامل بنا کر بھیجتے ہیں، تو یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ آنے کے بعد کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے، وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں بیٹھ کر تو دیکھے کہ اسے ہدیہ کیا جاتا ہے یا نہیں؟۔(۱)

ایک موقع پر خاص اہتمام سے آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جو شخص میری جانب سے خدمت پر مامور ہو اور وہ ہم سے ایک دھاگہ بھی چھپائے، تو وہ حرام ہے جسے وہ قیامت کے دن لے کر آئے گا۔(۲)

گویا حکمرانوں، ذمہ داروں اور عہدیداروں کو مال کے معاملہ میں زیادہ محتاط کردار ادا کرنا چاہیے، کیونکہ کسی عہدہ پر فائز کیا جانا اس پر کامل درجہ اعتماد اور اس کی دیانت پر پورے بھروسہ کی دلیل ہے، اگر وہی بے راہ روی کی راہ اختیار کرلے اور خیانت کا ارتکاب کر بیٹھے، تو دوسروں پر کیا اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

اس احتیاط کی وجہ ظاہر ہے کہ قومی سرمایہ تک اس کی رسائی ہوتی ہے، وہ نہ صرف اپنا بلکہ پوری قوم کے مفادات کا محافظ اور چوکیدار ہوتا ہے، اور اس کے لئے جرم کرنے اور دوسروں کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی ان ہدایات اور تعلیمات کی اہمیت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب ایوان اقتدار میں رشوت رسانی اور حریص سیاست دانوں کی قوم سے غداری کے واقعات منظر عام پر آتے ہیں، الغرض رشوت کسی بھی ملک کے لئے ایک ناسور ہے، جس سے اس ملک کی جڑیں کھوکلی ہو جاتی ہیں۔

---

(۱) بخاری حدیث نمبر ۷۱۷۴

(۲) ابوداؤد حدیث نمبر ۳۵۸۱

صاحب منصب کو ہدیہ کے نام سے رشوت دینا:

کسی سرکاری منصب پر فائز شخص کو اس کے ظلم وزیادتی سے بچنے کے لئے یا اپنا کام بآسانی کرانے کے لئے یا کوئی غیر قانونی کام کرانے کے لئے جو رقوم ہدایا اور تحفہ تحائف دئے جاتے ہیں وہ رشوت ہیں، اسلئے اس شخص کیلئے ان چیزوں کا لینا جائز نہیں، حرام ہے۔

البحر الرائق میں ہے:

"ابرأه عن الدين ليصلح مهمة عند السلطان لا يبراء وهو رشوة بخلاف الإبراء في الأول، لأنه مقصور على إصلاح المهم، و إصلاح المهم مستحق عليه دیانة وبذل المال فيما هو مستحق عليه هو الرشوة"۔(۱)

اس لئے کسی بھی سرکاری ملازم کا تنخواہ کے علاوہ دوران ملازمت کام کرانے کے لئے کسی سے کچھ لینا یا مانگنا یہ رشوت ہے، اگر کام کا معاوضہ دیتے ہوں، تو بغیر مانگے بھی رشوت ہے، البتہ دوستی یا رشتہ داری میں دوست یا رشتہ دار جو کچھ دیتے ہیں، وہ جائز ہے، وہ رشوت نہیں ہے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو کسی سے مانگتے نہیں، لوگ بخوشی دیتے ہیں، خواہ وہ شیرینی کے نام سے ہو، یا چائے پانی کے نام سے ہو، رشوت ہے اور اس کا لینا حرام ہے۔

سرکاری ملازم کا کمیشن لینا رشوت ہے

سرکاری ملازمین کو حکومت ان کے فرائض منصبی کی ادائیگی پر باقاعدہ تنخواہ دیتی ہے اور جب حکومت کی طرف سے ان کی تنخواہ مقرر ہے، تو ان کے ذمے عوام کا جو کام ہے، اس کے کرنے پر عوام سے کمیشن لینا ہرگز جائز نہیں، یہ رشوت اور خیانت ہے، جو شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اور بعض صاحب منصب یہ کہتے ہیں کہ ہم ذاتی محنت اور کوشش سے ان کا کام

(۱) البحر الرائق، باب المهر، قبيل بحث الخلوة: ۳ / ۱۶۲

کرا کر دیتے ہیں، اس لئے اس پر ان سے کمیشن لیتے ہیں، ان کا یہ کہنا بالکل غلط ہے، کیونکہ یہ کام ان کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

غیر حقدار کو رشوت لے کر نوکری دینا:

جو شخص ملازمت کے قانون کے مطابق مطلوبہ صحیح کاغذات نہ رکھتا ہو، اور اس میں ملازمت کے فرائض انجام دینے کے لئے مطلوبہ معیار کے مطابق اہلیت وصلاحیت نہ ہو اور اس کے مقابلے میں نوکری کے خواہشمند صحیح کاغذات رکھنے والے دوسرے باصلاحیت افراد موجود ہوں۔

مگر افسر بالا غیر حقدار اور نااہل شخص کو محض رشوت لے کر نوکری دے دیتا ہے، تو اس طرح رشوت لینا اور دینا دونوں ناجائز اور حرام ہیں، اور دونوں سخت گناہ گار ہوں گے، اور چونکہ اس ملازم کے اندر اس ملازمت کے فرائض انجام دینے کی اہلیت وصلاحیت موجود نہیں ہے، اس لئے اس نوکری پر ملنے والی تنخواہ بھی اس کے لئے حرام ہے۔

ایسی ملازمت کا حکم جس میں رشوت دینا پڑتی ہو:

جس طرح رشوت لینا گناہ ہے، اسی طرح رشوت دینا بھی گناہ ہے، جو شخص رشوت دیتا ہو، لیتا نہ ہو، تو رشوت دینے کا گناہ تو اس کو ہوگا، لیکن اس کی وجہ سے اس کی آمدن حرام نہ ہوگی۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: ایک شخص ایک ایسی کمپنی میں کام کرتا ہے جو درآمد برآمد کا کام کرتی ہے، کمپنی کے اس ملازم کو اس کاروبار کے سلسلہ میں مختلف مراحل میں رشوت دینا پڑتی ہے، کیا ایسی ملازمت جائز ہے اور ایسے شخص کے ہاں کھانا کھانے کا کیا حکم ہے، بینوا تو جروا

الجواب باسم ملہم الصواب: رشوت دینا اور لینا دونوں حرام ہیں، اس ملازم پر فرض ہے کہ یہ ملازمت ترک کر کے دوسرا کوئی ذریعہ معاش اختیار کرے، اس کے ہاں کھانا کھانا بہر حال جائز ہے۔(۱)

سرکاری افسران کا لوگوں کی مہمان نوازی قبول کرنا

سرکاری افسران جب کسی کام کے سلسلے میں مختلف مقامات کا دورہ کرتے ہیں، یا دوسرے محکموں میں آڈٹ کے لئے جاتے ہیں، تو وہاں کے لوگ ان کو مہمان سمجھ کر کھانا یا چائے وغیرہ پلاتے ہیں، ایسی صورت میں سرکاری افسران کو چاہئے کہ لوگوں سے کھانے وغیرہ کے لئے کچھ بھی نہ لیا جائے، لیکن اگر وہ ناراض ہوتے ہوں، تو ان کے ہاں کھانے کی گنجائش ہے، البتہ اس میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس کھانے کی وجہ سے فرائض منصبی میں کمی کوتاہی واقع نہ ہو، جس کام کے لئے گئے ہیں اس کو صحیح طرح کیا جائے اور اس کام پر اثر نہ پڑے، تو جائز ہے ان کی مہمانی قبول کر سکتے ہیں، البتہ سرکاری افسران کی طرف سے مطالبہ نہیں ہونا چاہئے۔

آپ کے مسائل اور کا حل میں ہے:

"سوال: آڈٹ کے محکمے سے متعلق ہونے کی وجہ سے دوسرے محکموں میں جا کر آڈٹ کرنا پڑتا ہے، وہ لوگ مہمان سمجھ کر کھانے کا یا چائے کا بندوبست کرتے ہیں، نہ کھانے پر ناراض ہوتے ہیں یا آڈٹ کرنے میں تعاون میں سستی کرتے ہیں، کھانے یا چائے کے پیسے بھی ہمیں ادا کرنے نہیں دیتے، دوسری جگہ جا کر ان چیزوں کا اپنے بندوبست سے حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے، اس کھانے سے نہ ہم اپنے فرائض میں کوتاہی کرتے ہیں، اور نہ وہ اس وجہ سے

(۱) احسن الفتاویٰ: ۷ / ۳۲۲

تقاضا کرتے ہیں کہ اعتراض معاف کر دئے جائیں، ایسی حالت میں کھانا یا چائے قبول کرنا چاہئے یا نہیں، ہمارے افسران نہ اس چیز کو منع کرتے ہیں نہ قبول کرنے کو کہتے ہیں، ہاں خود جائیں تو کھا پی لیتے ہیں۔

جواب: ہمارے معاشرے میں سرکاری افسران کو کھلانے پلانے کا معمول ہے، اس لئے لوگ اس پر بضد ہوتے ہیں، اگر ممکن ہو تو ان سے کہہ دیا جائے کہ ہمیں سفر کے لئے سرکاری خرچ ملتا ہے، اس لئے کھانے پینے کے مصارف ہم خود ادا کریں گے، البتہ تیاری کے انتظامات کر دئے جائیں، اگر لوگ اس پر راضی ہو جائیں تو یہ انتظام کر لیا جائے، ورنہ بحالت مجبوری ان کی ضیافت کو گوارا کر لیا جائے لیکن اس ضیافت کا اثر فرائض کی بجا آوری پر واقع نہ ہو۔(۱)

رشوت خور کی بیوی کی ذمہ داری:

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

"اگر کسی عورت کا شوہر رشوت کا پیسہ گھر لاتا ہو اور وہی رشوت کا پیسہ وہ گھر میں بیوی بچوں کو کھلاتا ہو، تو اس صورت میں بیوی کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو پیار و محبت سے سمجھائے، اگر وہ نہیں سمجھتا تو صاف صاف کہہ دے کہ میں بھوک سے مر جاوں گی، لیکن حرام پیسہ استعمال نہیں کروں گی، عورت اگر اس پر عمل کرلے اور شوہر اس کے باوجود منع نہ ہو، تو اس صورت میں گناہ صرف مرد کو ملے گا، عورت پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اور اگر عورت اس کو منع نہیں کرتی اور

---

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۱۰ / ۳۱۴

رشوت سے روکتی نہیں ہے بلکہ اس کا حرام کا لایا ہوا روپیہ عورت خرچ کرتی ہے تو دونوں گناہ گار ہوں گے، عورت کو بھی رشوت کھانے کا گناہ ملے گا"۔(۱)

دفتری فائل دکھانے پر معاوضہ لینا:

سوال: میں ایک دفتر میں ملازم ہوں، ہمارے ہاں ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی فائل دیکھنے آتا ہے کہ میری فلاں فائل ہے، یا میری فائل نمبر یہ ہے، اگر دکھادیں تو بہت مہربانی ہوگی، اور یہ کہ یہ چیز اس مین سے ٹائپ کر کے مجھے دے دیں، ہمارے سینئر کلرک ان سب باتوں کو پورا کر دیتے ہیں، وہ شخص سینئر صاحب کو کچھ رقم دے دیتا ہے، ہمارے سینئر صاحب اس میں سے ہمیں بھی دے دیتے ہیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ یہ رشوت تو نہ ہوئی اور اگر ہوئی بھی تو اس کی ذمہ داری ہمارے سینئر کلرک پر آئے گی، یا ہم پر؟ اگر اس مسئلہ کا حل بتادیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔

جواب: فائل نکالنے، دکھانے اور ٹائپ کرنے کی اگر سرکاری اجرت مقرر ہے، تو اس اجرت کا وصول کرنا صحیح ہے (اور اس کا مصرف وہ ہے جو قانون میں مقرر کیا گیا ہو) اس کے علاوہ کچھ لینا رشوت ہے اور گناہ میں سب شریک ہوں گے، جن جن کا اس میں حصہ ہوگا۔(۲)

ملازمین کے لئے سرکاری تحفہ جائز ہے

اگر کمپنی یا محکمے والے ملازم کے کام سے خوش ہو کر اسے اضافی تنخواہ دیں، یا کوئی تحفہ

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۶ / ۱۷۶

(۲) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۶ / ۱۸۳

دیتے ہیں، جو کسی بھی شکل میں ہو، تو یہ رشوت نہیں ہے، اور نہ ہی اس پر رشوت کی تعریف صادق آتی ہے، یہ زیادہ سے زیادہ انعام ہی ہوسکتا ہے، اس کا لینا ملازم کے لئے جائز ہے، گورنمنٹ یا انتظامیہ اپنے ملازمین کے حوصلہ افزائی کے لئے جو کچھ بھی ملازمین کو دیتے ہیں، خواہ تنخواہ ہو، یا بونس ہو، یا انعام ہو، سب جائز ہے۔

مولانا یوسف لدھیانویؒ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''جواب: حکومت کی طرف سے جو کچھ دیا جائے، اس کے جائز ہونے میں کیا شبہ ہے، مگر سرکاری ملازم لوگوں کا کام کر کے ان سے جو ''تحفہ'' وصول کرے، وہ رشوت ہی کی ایک صورت ہے، ہاں اس کے دوست احباب یا عزیز واقارب تحفہ دیں، تو وہ واقعی تحفہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ گورنمنٹ یا انتظامیہ اپنے ملازمین کو جو کچھ دیتی ہے، بونس ہو یا انعام، وہ سب جائز ہے''۔(۱)

مجبوری سے رشوت دینا:

ہمارے زمانے میں اکثر مقامات پر ایسی مشکلات کھڑی کردی گئی ہیں کہ رشوت دینے کے لئے آدمی مجبور ہو جاتا ہے، حتی الوسع رشوت دینے سے بچا جائے، کیونکہ حدیث میں رشوت لینے اور دینے والوں کے بارے میں وعید آئی ہے، لیکن اگر کسی کا جائز کام جو اس کا حق ہو، وہ بھی بغیر رشوت کے نہ ہوتا ہو، تو ایسی صورت میں رشوت دے کر اپنا کام کرنے کی گنجائش ہے، البتہ اس صورت میں لینے والے کے لئے کسی بھی صورت میں رشوت حلال نہیں ہوگی، اس کا گناہ لینے والے پر ہوگا۔

ملازمین میں رشوت کی مروجہ صورتیں:

۱۔ ملازمت کے حصول کے لئے رشوت لینا، یا رشوت لینا دونوں حرام ہیں۔

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۶/ ۱۸۷

۲۔ کسی صاحب منصب کو اس کے منصب کی وجہ سے تحفہ تحائف دینا یہ بھی رشوت ہے اس کا لینا بھی حرام ہے۔

۳۔ اسی طرح مختلف اداروں میں آڈٹ کرنے والے سرکاری افسران کو تحفہ، گفٹ، ہدیہ وغیرہ کے نام سے جو کچھ دیا جاتا ہے ، یہ رشوت ہے اس کا لینا اور دینا دونوں حرام ہے۔

۴۔ اداروں میں مختلف سہولیات حاصل کرنے کے لئے رقم دینا یہ بھی رشوت ہے جیسے مختلف الاونس حاصل کرنا، یا اپنے آپ کو شادی شدہ ظاہر کر کے محکمے سے مکان کا کرایہ وصول کرنا، ان مقاصد کے حصول کے لئے افسران کو پیسے دینا یہ بھی رشوت ہے اور حرام ہے۔

۵۔ سرکاری محکموں میں کام کرنے والے افسران کو مختلف کام کروانے کیلئے پیسے دینا، جیسے شناختی کارڈ بنوانے کے لئے ، یا فارم (ب) بنوانے کے لئے ، ڈرائیونگ لائسنس حاصل کرنے کے لئے ، ویزا کے حصول کے لئے ، اصل خرچ سے زیادہ رقم کسی بھی سرکاری افسر کو دینا کام جلدی کروانے کے لئے یہ رشوت ہے اور حرام ہے۔

۶۔ ڈیوٹی سے غیر حاضر شخص کی حاضری رجسٹر میں لگوانے کیلئے پیسے دینا رشوت ہے۔

باب......(۹)

ملازمین کے نماز، زکوۃ، وغیرہ کے مسائل

نماز کے لئے مسجد جانے کا حکم:

مسئلہ: اگر دفتر کے قریب مسجد ہو، تو ملازم قریبی مسجد میں نماز با جماعت ادا کرے، اگر مسجد دور ہو مثلاً میل، دو میل کے فاصلے پر ہو، تو اگر محکمہ یا کمپنی کی طرف سے اتنا دور جانے کی اجازت ہو، تو نماز با جماعت کے لئے جانا صحیح ہے، لیکن اگر محکمہ کی طرف سے اتنا دور جانے کی اجازت نہ ہو، تو دفتر ہی میں نماز با جماعت کا انتظام کیا جائے۔

نماز کی قصر کا مسئلہ:

اگر کوئی شخص اپنے وطن اور علاقے سے ۷۸ کلومیٹر سے زیادہ سفر پر جائے، تو وہ اپنے شہر کی حدود سے نکل کر قصر کرے گا، اور جب اپنے شہر کے حدود میں داخل ہو، تو مقیم تصور ہوگا، اور پوری نماز پڑھے گا۔

قصر کس مسافر کے لئے ہے؟

قصر کا یہ حکم ہر شرعی مسافر کے لئے ہے، سفر خواہ دینی غرض سے ہو یا دنیاوی غرض سے ہو اور خواہ سفر مستقل اور دائمی ہو، یا گاہے گاہے ہو اور خواہ ملازمت و تجارت کے سلسلے میں ہو، یا سیر و سیاحت کی غرض سے ہو اور خواہ شرعی مسافت دیر سے طے ہو، یا چند گھنٹوں میں طے ہو،

جیسے آج کل ہوائی جہاز اور تیز رفتار سواریوں میں جلدی طے ہو جاتا ہے، ان تمام صورتوں میں مسافر قصر کرے گا۔

ہمیشہ سفر میں رہنے والے کی نماز کا حکم:

اب اگر کسی کی ایسی ملازمت ہے کہ وہ ہمیشہ سفر ہی میں رہتا ہو، تو وہ شخص جب بھی اپنے شہر کی حدود سے نکلے گا، مسافر ہی تصور ہوگا اور قصر کرے گا، مذکورہ حکم ہر ریلوے ملازم کے لئے بھی ہے، وہ اپنے شہر کی آبادی سے نکلتے ہی قصر پڑھے گا، اگر چہ ڈیوٹی اور ملازمت کی حیثیت سے ہو، شرعاً سفر کے احکام اس پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔(۱)

بحری و ہوائی جہاز کے ملازمین کی نماز کا حکم:

بحری جہاز اور ہوائی جہاز کے ملازمین کا بھی یہی حکم ہے جب یہ لوگ اپنے وطن کے حدود سے نکل جائیں تو نماز قصر پڑھیں گے۔

شرعی مسافت سے کم سفر والے ملازم کی نماز کا حکم:

مسئلہ: اگر کوئی شخص ایسی جگہ ملازمت کر رہا ہے کہ اس کے گھر اور ملازمت کی جگہ کے درمیان ۸۷ کلومیٹر سے کم فاصلہ ہے، تو ملازم ملازمت کی جگہ بھی پوری نماز پڑھے گا، قصر نہیں کرے گا اور گھر میں بھی پوری ہی نماز پڑھے گا۔

ملازمت کی جگہ میں نماز کا حکم:

مسئلہ: بعض سرکاری ملازمین اپنے بیوی بچوں کو ملازمت کی جگہ میں مستقل طور پر رکھتے ہیں، پھر وہاں سے مختلف مقامات کا دورہ کرتے ہیں، یہ لوگ جب اپنے بیوی بچوں کی قیام

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۲ / ۳۸۰

گاہ پر پہنچیں گے، تو مقیم شمار ہوں گے، یعنی سفر کی صورت میں تو قصر کریں گے، لیکن ملازمت کی جگہ پہنچ کر پوری نماز پڑھیں گے۔

مسئلہ: اگر کسی آدمی کی ملازمت اپنے علاقے سے ۷۸ کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر ہے اور وہاں جا کر مکان کرایہ پر لے کر رہتا ہے اور گھر کا ضروری سامان بھی رکھا ہے اور وہاں پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرتا ہے، تو وہاں پہنچ کر یہ آدمی مقیم بن جائے گا اور وہاں نماز پوری پڑھے گا، اور اگر اس کے ساتھ بیوی بچے بھی ہوں، تو یہ لوگ بھی پوری نماز پڑھیں گے، کیونکہ بیوی بچے، مرد کے تابع ہوتے ہیں۔

پندرہ دن سے کم کی صورت میں نماز کا حکم:

اگر ملازمت کی جگہ پر ہمیشہ پندرہ دن سے کم رہتا ہے، تو مسافر ہونے کی وجہ سے قصر کرے گا، ہندیہ میں ہے:

"وإن نوى الإقامة أقل من خمسة عشر يوما قصر، هكذا في الهداية"۔(۱)

ملازمت کی جگہ پر جب تک بیوی بچوں کے ساتھ رہے گا پوری نماز پڑھے گا قصر نہیں کرے گا۔

ملازمت کی جگہ وطن اصلی ہے یا نہیں؟

ایک آدمی کے لئے وطن اصلی متعدد ہو سکتے ہیں، اور شریعت میں وطن اصلی صرف اس جگہ کو نہیں کہتے، جہاں انسان پیدا ہوا ہو، بلکہ ہر اس جگہ کو وطن اصلی کا درجہ حاصل ہے جہاں انسان آرام وراحت کا سامان لے کر بیوی بچوں کے ساتھ مستقل طور پر رہنے کی نیت سے قیام کرتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص ملازمت کی جگہ پر بیوی بچوں کے ساتھ آرام وراحت کا

(۱) الفتاوى الهنديه: ۱/ ۱۳۹

سامان لے کر رہتا ہے، تو وہ بھی وطن اصلی کے درجہ میں ہوتا ہے، لہٰذا جب ۷۸ کلو میٹر یا اس سے زیادہ مسافت سفر کر کے وہاں پہنچ جائے گا، تو قصر نہیں کرے گا، بلکہ پوری نماز پڑھے گا، خواہ اس میں پندرہ دن قیام کرنے کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔

ملازم کو معلوم نہیں کہ کب اور کہاں سفر کرنا پڑے گا

اگر ملازمین اپنے علاقے سے ۷۸ کلو میٹر دور ملازمت کر رہے ہوں اور ملازمین کو یہ یقین ہو یا ظن غالب ہو کہ ہر ماہ پندرہ دن سے پہلے سفر پر جانا ہوگا، یعنی ملازمت کی جگہ میں پندرہ دن سے کم ٹھہرنا ہوگا، تو اس صورت میں ایسے ملازمین وطن اقامت یعنی ملازمت کی جگہ میں قصر ہی کریں گے کیونکہ ان کو پندرہ دن سے کم ٹھہرنا پڑتا ہے۔

درمختار میں ہے:

(فیقصر إن نوی)الإقامة(فی أقل منه)أی فی نصف شهر ۔(۱)

اور اگر یقین یا غالب گمان نہ ہو، بلکہ صرف وہم یا خیال ہو کہ شاید سفر کا حکم آجائے، تو اس کا اعتبار نہ ہوگا، اس صورت میں یہ ملازمین مقیم ہی ہوں گے، لہٰذا ایسے ملازمین پوری نماز پڑھیں گے، اسی طرح ملازمین کو جہاں بھیجا جاتا ہے، تو اگر وہاں پندرہ دن سے کم قیام ہے، تو قصر کریں گے اور اگر پندرہ دن یا اس سے زیادہ کا قیام ہے، تو پوری نماز پڑھیں گے۔

اقامت وسفر میں نوکر کا حکم:

نوکر کی دو قسمیں ہیں:

۱)......اگر نوکر ماہانہ تنخواہ دار ہے، اور مالک کے ساتھ ہے، تو سفر اور اقامت کی نیت میں نوکر مالک کے تابع ہوگا۔

(۱) الدر المختار: ۲ / ۱۲۵ ۔ کتاب الصلاة

۲)......اور اگر نوکر سالانہ یا ماہانہ تنخواہ پر نہ ہو، بلکہ یومیہ تنخواہ پر، یعنی روزانہ کام کر کے تنخواہ لیتا ہو، یا ویسے ہی ثواب کی نیت سے کسی کا خادم بنا ہو، تو یہ نوکر مالک کے تابع نہ ہوگا، اس صورت میں نوکر کی نیت کا اعتبار ہوگا۔

فوجی نماز کس طرح پڑھیں گے

جنگی حالت میں عام طور پر فوجی لوگ میدان جنگ میں شامل ہوتے ہیں، دس دن کہیں، بیس دن کہیں، ٹھہرنا ہوتا ہے اور فوجیوں کو عام طور پر پہلے سے کوئی اطلاع بھی نہیں ہوتی، چاہے ایک دن میں گھر واپس آجائیں، یا دس سال تک بھی واپس نہ آئیں، اس صورت میں فوجی حضرات قصر پڑھیں گے، پوری نماز نہیں پڑھیں گے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

"قال شمس الأئمه الحلوانی ؒ: عسکر المسلمین إذا قصدوا موضعا و معهم أخبیتهم و خیامهم و ساطیطهم فنزلوا مفازة فی الطریق و نصبوا الأخبیة و الفساطیط و عزموا فیها علی إقامة خمسة عشر یوما لم یصیروا مقیمین، لأنها حمولة، و لیست بمساکن"۔(۱)

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

''سوال: جو آفیسر اپنے ماتحت یونٹوں کی دیکھ بھال کے لئے دور جاتے ہیں، یعنی تقریباً اٹھائیس میل کی مسافت طے کرتے ہیں، تو کیا یہ لوگ قصر کریں گے؟

جواب: اگر پوسٹ جس کی چیکنگ کے لئے جا رہا ہے، شہر کی آخری حدود سے اڑتالیس میل دور ہے، تو قصر کر سکتا ہے، (یعنی قصر کرے گا)

(۱) الفتاوی الهندیه، کتاب الصلاة _باب صلاه المسافر: ۱ / ۱۳۹ ـ

سوال: ایک آفیسر فوجیوں کو لے کر جب دور دراز کے علاقوں میں جاتے ہیں، وہاں قیام کا کوئی پتہ نہیں ہوتا، جب کسی آفیسر سے دریافت کیا جاتا ہے، تو بھی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ فوج میں قانون ہے کہ قیام کی حد کا کسی کو نہیں بتایا جاتا، تو اس صورت میں قصر کیا جائے گا، یا نہیں ؟

جواب: مذکورہ صورت میں فوجیوں کو قصر کرنا چاہیے ، جب تک پندرہ دن قیام کرنے کا عزم نہ ہو، قصر ہی کیا جائے گا، خواہ اس غیر یقینی حالت میں کئی مہینے گذر جائیں۔

سوال: اگر یہ چھوٹے چھوٹے یونٹوں والے سپاہی اور نوکر وغیرہ ہیڈ کوارٹر کو پندرہ دن سے کم مدت کے لئے گئے، تو کیا یہ سپاہی قصر کریں گے، یا اتمام؟

جواب: اگر یونٹ سے ہیڈ کوارٹر کے شہر کا فاصلہ اڑتالیس میل ہے، تو قصر کریں گے۔(۱)

تنخواہ دار ملازم کو زکوۃ دینا:

ایک آدمی تنخواہ دار ہے، لیکن اس کے گھریلو شرعی اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ وہ تنخواہ سے بمشکل پورے ہوتے ہیں، بچت نہیں ہوتی، تو اس کو زکوۃ دینا جائز ہے، بشرطیکہ اس کے پاس سونا، چاندی اور ضرورت سے زیادہ اشیاء اتنی نہ ہوں جن کی مالیت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہو جائیں۔

ملازم کو زکوۃ دینا:

اپنے گھر یا دکان پر ملازمت کرنے والے شخص یا عورت کو زکوۃ دینے میں یہ تفصیل ہے

(۱) فتاوی عثمانی: ۱/ ۵۵۰

کہ اگر وہ ملازم غریب ہے اور زکوۃ کا مستحق ہے، یعنی صاحب نصاب نہ ہو، اور سید نہ ہو، تو اس کو زکوۃ دینا جائز ہے، لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ رقم تنخواہ میں شمار نہ ہوگی، زکوۃ میں ہی شمار ہوگی۔

فتاویٰ دار العلوم دیوبند میں ہے:

سوال ۷۴۴: زکوۃ یا فطرہ کے دام اپنی خادمہ کھانا پکانے والی کو اگر غریب ہو، دے سکتے ہیں، یا نہیں؟۔

الجواب: اپنی خادمہ کھانا پکانے والی کو زکوۃ فطرہ اس وجہ سے دینا کہ وہ محتاج و غریب ہے اور تنخواہ نہ دی جائے تو یہ درست ہے، البتہ تنخواہ میں دینا جائز نہیں ہے۔(۱)

ضمانت کی رقم پر زکوۃ کا حکم:

مسئلہ: اگر کسی شخص نے سرکاری ملازمت کے دوران ملازمت کی ضمانت کے طور پر حکومت کے پاس کچھ رقم جمع کرائی ہو، تو اگر یہ شخص صاحب نصاب ہے، تو اس رقم کی زکوۃ ادا کرنا اس پر لازم ہوگا۔

سوال:۱۹۴۔ایک شخص نے بغرض ضمانت ملازمت مبلغ ایک سو روپیہ سرکار میں جمع کیا، جب تک وہ شخص ملازم رہے گا، اس وقت تک اس کو ضمان واپس نہیں ملے گا، جب پنشن لے گا، یا کسی وجہ سے برخاست ہوگا، تب وہ روپیہ اس کو دیا جائے گا، اب اس روپیہ پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟ اگر واجب ہے، تو بعد واپسی کے یا ہر سال اس کو زکوۃ ادا کرنا واجب ہوگا۔

الجواب: اس روپے کی زکوۃ بعد واپسی کے تمام گذشتہ سالوں کی ادا کرنا لازم

(۱) فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۶/ ۱۳۹ ۔ فتاویٰ عثمانی: ۲/ ۱۳۶

ہے، اگر اس خیال سے کہ بعد واپسی کے بہت برسوں گذشتہ کی زکوۃ دینی پڑے گی، اور رقم کثیر ہو جائے گی ہر سال موجودہ روپے کیساتھ زکوۃ دیدیا کرے، تو یہ بھی درست ہے۔(۱)

زکوۃ کی رقم سے تنخواہ دینے کا حکم:

زکوۃ کی رقم سے مدرسہ کے ملازمین کی تنخواہ ادا کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ زکوۃ بلا کسی معاوضہ تعلیم وغیرہ کے للہ مساکین اور غرباء کو دینا اور ان کو مالک بنانا ضروری ہے، اگر ملازمین زکوۃ کے مستحق ہیں، تو ان کو تنخواہ سے ہٹ کر الگ زکوۃ دے سکتے ہیں۔

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

سوال: میرے ہاں ایک ملازم ہے جس نے تنخواہ میں اضافہ کا مطالبہ کیا، تو میں نے زکوۃ کی نیت سے اضافہ کر دیا، اب وہ یہ سمجھتا ہے کہ تنخواہ میں اضافہ ہوا، اسی کے بدلہ میں کام کر رہا ہوں، کیا اس طرح دی ہوئی میری زکوۃ ادا ہوئی یا نہیں؟

جواب: ملازم کی تنخواہ تو اس کے کام کا معاوضہ ہے اور جب آپ نے تنخواہ بڑھانے کے نام پر اضافہ کیا، تو وہ بھی کام کے معاوضہ میں ہوا، اس لئے اس سے زکوۃ ادا نہیں ہوئی، جو تنخواہ اس کے ساتھ طے ہو، وہ ادا کرنے کے علاوہ اگر اس کو ضرورت مند اور محتاج سمجھ کر زکوۃ دے دی جائے، تو زکوۃ ادا ہو جائے گی۔(۲)

اسی طرح اگر کسی نے ملازم کو قرض دیا ہو، تو اس میں زکوۃ کی نیت کر لینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو زکوۃ دے کر وہ رقم واپس قرض میں وصول کر لی جائے، یا وہ

(۱) فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ٦ / ٦٣

(۲) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ٣ / ٣٨٤

کسی سے قرض لے اور مالک کا قرض ادا کردے اور مالک قرض لے کردہ رقم واپس اس کو زکوۃ میں دیدے، اس طرح زکوۃ ادا ہو جائے گی، یہ کافی نہیں کہ قرض میں ہی زکوۃ کی نیت کر لی جائے۔

تنخواہ میں اضافے کی رقم پر زکوۃ کا حکم:

اگر کوئی شخص کسی کمپنی میں یا سرکاری ملازم ہے، اور وہ صاحب نصاب بھی ہے، ہر سال زکوۃ ادا کرتا ہے، تو اگر اس کی تنخواہ میں اضافہ ہو جائے، اس کی تنخواہ بڑھ جائے، تو اگر زکوۃ کا سال پورا ہونے سے پہلے اس کی تنخواہ بڑھ گئی، تو اس سال زکوۃ ادا کرتے ہوئے اس رقم کی زکوۃ بھی ادا کرے گا، لیکن اگر ایسا ہوا کہ وہ شخص مثلاً یکم جنوری کو اس کا سال پورا ہوتا ہے، اور جنوری سے پہلے دسمبر میں اس کی تنخواہ بڑھ گئی، لیکن کاغذی کارروائی ہوتے ہوئے اس کو اضافی تنخواہ یکم جنوری کے بعد ملے گی، تو آیا اب یہ زکوہ اس اضافی رقم کی اس سال ادا کرے گا یا اگلے سال ادا کرے گا۔

اصول تو یہ ہے کہ جب تنخواہ میں اضافہ کی رقم جب اس کو ملے گی، تو اس وقت اس پر زکوۃ واجب ہوگی، لہٰذا اس رقم کی زکوۃ یہ شخص اگلے سال نکالے گا، اگر چہ کاغذی طور پر یہ اس رقم کا مستحق ہوا ہے، لیکن اس کو یہ رقم ملی نہیں، اس لئے اس سال اس پر اس رقم کی زکوۃ لازم نہیں ہوگی، بلکہ آئندہ سال جب زکوۃ کی تاریخ پوری ہوگی، اس وقت جتنی رقم اس کے پاس ہوگی، اس کی زکوۃ ادا کی جائے گی، لیکن یہ مسئلہ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک پر ہے، صاحبین کے نزدیک چونکہ ہر قسم کے دین پر زکوۃ فرض ہے، اس لئے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اسی سال اس کی زکوۃ ادا کی جائے۔(۱)

---

(۱) هكذا في فتاوىٰ عثماني : ۲ / ۵۷

باب......(۱۰)

ملازمت کا تحفظ

اوراس سے متعلقہ شرعی احکام

بہت سارے افراد ملازمت کا تحفظ چاہتے ہیں، اور اس کا مطالبہ بھی بکثرت کیا جاتا ہے، چنانچہ ملازمت کے تحفظ کے لئے بعض اداروں نے قوانین بھی مرتب کیے ہیں، جیسا کہ سرکاری ملازمین کے رائج الوقت عام قوانین کے تحت ملازمین کی ریٹائرمنٹ (Retirement) کے لئے عمر کی ایک حد مقرر کی گئی ہے، جس سے پہلے ان کو ریٹائر نہیں کیا جا سکتا، اور انہی سرکاری ملازمین کی بعض ایسی کیٹاگریاں ہیں، جس میں افسران بالا مفاد عامہ کو بہانہ بنا کر ان کو ریٹائرمنٹ کی عمر آنے سے پہلے ہی ریٹائر کر سکتے ہیں۔

جبکہ اکثر پرائیویٹ اداروں نے اس سلسلہ میں یہ ضابطہ مقرر نہیں کر رکھا ہے، چنانچہ آجر اور اجیر باہمی رضامندی سے جس مدت تک چاہئیں ملازمت کرتے رہتے ہیں اور جب ان میں سے ایک فریق ملازمت ختم کرنا چاہے، تو اس کو ختم کر سکتا ہے، یہ ادارے ریٹائرمنٹ کے لئے پہلے سے کوئی حد مقرر نہیں کرتے، اس لئے اس دوسری صورت میں ملازمت کا تحفظ اس درجہ کا نہیں ہوتا، جتنا کہ پہلی صورت میں ہوتا تھا، اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کی وضاحت کی جائے کہ ملازمت کے تحفظ کے بارے میں شرعی احکام کیا ہیں؟ اور قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

سرکاری اور غیر سرکاری ملازمین کے قوانین کا تعلق درحقیقت ان کے اپنے مرتب کردہ

نظام سے ہے، شریعت نے ان معاملات کی جزوی تفصیلات خود متعین نہیں فرمائیں، بلکہ اس کو ہر دور کے مسلمانوں پر چھوڑ دیا، کہ وہ شریعت کے بنیادی اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے یہ تفصیلات اپنے زمانہ اور اپنے خطے کے حالات کے مطابق خود طے کرلیں، یہ تفصیلات جب تک شریعت کے بنیادی اصولوں میں سے کسی اصول سے نہ ٹکراتی ہوں، اس وقت تک ان کو شریعت کے خلاف اور قرآن وسنت سے متصادم نہیں کہا جاسکتا۔

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ ملازمین کا تقرر آجر اور اجیر کے عام قواعد کے تحت کیا جائے گا اور ان کی ملازمتوں کو تحفظ حاصل ہوگا یا نہیں؟ اور کیا وقت سے پہلے ان کو ریٹائر کیا جاسکے گا یا نہیں؟

اس بارے میں بھی شریعت نے ہمیشہ کے لئے کوئی طریق کار اور اصول متعین نہیں کئے، بلکہ اس کو ہر دور کے مسلمانوں کی رائے پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے اپنے دور کی مصلحتوں کو دیکھتے ہوئے جو طریق کار اختیار کرنا چاہیں وہ کرلیں، اسلام ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

ملازمت کا عام قاعدہ یہ ہے کہ آجر اور اجیر کے درمیان مدت ملازمت، تنخواہ، ذمہ داریوں سے متعلق جو تفصیلات بھی باہمی رضاء مندی سے طے ہو جائیں، فریقین پر ان کی پابندی لازم ہوتی ہے، بشرطیکہ ان میں بذات خود کوئی ناجائز بات شامل نہ ہو، ان شرائط کے مطابق کسی کارروائی کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔ نیز آجر کو اس بات کا بھی حق حاصل ہے کہ وہ مختلف اجیروں سے مختلف شرائط طے کرے۔

آجر کے لئے یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ وہ تمام ملازمین کے ساتھ ایک ہی مدت ملازمت طے کرے، بلکہ کسی کے ساتھ کوئی مدت طے کرسکتا ہے، اور کسی کے ساتھ دوسری طے ہوسکتی ہے، بلکہ ملازمت کی مدت افراد کے بدلنے سے مختلف ہوسکتی ہے، اور آجر اس فرق کی وجہ بیان کرنے کا پابند بھی نہیں، یہی وجہ ہے کہ فریقین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ملازمت کے لئے جو چاہیں مدت طے کرلیں۔

ایک آجر اپنے ماتحت مختلف افراد کے ساتھ مختلف مدت ملازمت طے کرسکتا ہے، اگر کسی آجر نے ایک شخص کو تین سال کے لئے ملازم رکھا اور یہ بات معاہدہ کی ابتداء ہی سے طے تھی، تو پھر مدت ملازمت پوری ہونے پر آجر اسے ملازمت سے علیحدہ کرسکتا ہے۔

اسی طرح اگر کسی آجر نے اپنے کسی دوسرے ملازم کو آٹھ سال کے لئے ملازم رکھا، تو بھی مدت ملازمت پوری ہونے پر وہ اپنے ملازم کو ملازمت سے علیحدہ کرسکتا ہے، اس علیحدگی کی کوئی وجہ بتانا بھی آجر کے لئے کوئی ضروری نہیں ہے۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"المسلمون على شروطهم إلا شرطا حرم حلالاً أو أحل حراماً"۔(۱)

ترجمہ: مسلمان اپنی طے کی ہوئی شرائط کے پابند ہیں، سوائے اس شرط کے جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دے۔

اس حدیث کی روشنی میں حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نے یہ حکم بیان فرمایا ہے کہ ملازمت کے آغاز میں فریقین کے درمیان جتنی مدت مقرر ہوئی ہو، اس کے ختم ہوجانے پر اجارہ ختم ہوجاتا ہے، یہ بات تمام فقہاء کرام کے نزدیک مسلم ہے۔

جیسا کہ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

"ومنها انقضاء المدة إلا لعذر، لأن الثابت إلى غاية ينتهي عند وجود الغاية فتنفسخ الإجارة بإنتهاء المدة"۔(۲)

ترجمہ: ان اسباب میں سے ایک سبب مدت ختم ہوجانا ہے، الا یہ کہ مجبوری ہو، اس لئے کہ جو چیز کسی حد تک کے لئے ثابت ہو وہ اسی حد کے آنے پر ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا اجارہ بھی اسی طے شدہ مدت کے ختم ہوجانے پر ختم ہوجائے گا۔

---

(۱) جامع ترمذی، ابواب الاحکام، باب ۷۔ حدیث نمبر: ۱۳۵۲: (۳/ ۶۳۵)

(۲) بدائع الصنائع: ۴ / ۲۰۳

قرآن وسنت میں کوئی ایسی ہدایت نہیں ہے کہ جس کی رو سے ملازمت کو ہمیشہ کے لئے تحفظ فراہم کیا گیا ہو، اور ریٹائرمنٹ کے لئے عمر کی کسی حد کو مقرر کرنا ضروری ہو، بلکہ یہ معاملہ مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق ملازمین کے ساتھ مدت ملازمت کے سلسلے میں جس قسم کا چاہیں معاہدہ کرلیں، یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں ملازمین کا عزل ونصب تمام تر خلفاء کی رائے پر موقوف تھا، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"عزل ونصب کو اللہ تعالیٰ نے خلیفہ کی رائے پر چھوڑ دیا ہے، خلیفہ کو چاہئے کہ مسلمانوں کی اصلاح اور اسلام کی نصرت کی فکر کرے، اور اسی غور وفکر سے جو رائے قائم ہو اس پر عمل کرے، اور آنحضرت ﷺ مصلحت کی وجہ سے کبھی کسی کو معزول کر کے دوسرے کو مقرر کر دیتے، جیسا کہ فتح مکہ میں انصار کے نشان کو سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے ایک بات پر جو ان کی زبان سے نکل گئی تھی لے کر ان کے بیٹے قیس بن سعدؓ کو دے دیا، اور کبھی کسی مصلحت کی وجہ سے کم تر درجہ کے شخص کو مقرر کرتے، جیسا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو سردار لشکر کیا اور کبار مہاجرین کو ان کا ماتحت، یہ تقرر آپ نے آخری عمر میں کیا تھا، اسی طرح حضرات شیخینؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں کیا، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر خلفاء بھی ہمیشہ اس دستور پر عمل کرتے رہے۔(۱)

خلفائے راشدین کے زمانے کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس دور میں سرکاری ملازمین کا تقرر اور معزولی تمام تر باہمی معاہدے کی پابند تھی، اور ملازمین کے لئے کوئی ایسی یکساں مدت ملازمت مقرر نہیں تھی، جو تمام ملازمین کے لئے ہو،

---

(۱) ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء، مقصد دوم، باب مآثر عثمان: ۲ / ۴۷۹

اس کے بجائے خلیفہ ملک وملت کے مصالح کے پیش نظر عزل ونصب کے اختیارات رکھتا تھا اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہے کہ محض اپنے ذاتی مفاد یا ذاتی خواہشات کی بنیاد پر اسے ملازمین کے عزل ونصب کا اختیار تھا، نہیں۔ اس پر شرعاً واجب تھا کہ وہ عزل ونصب کا یہ فیصلہ خالص امت کے مصالح کی بنیاد پر کرے، جس کے لئے وہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہے، لیکن معاہدے کی معروف شرائط کے مطابق عزل ونصب کا فیصلہ کرتے وقت ہر حالت میں وہ متعلقہ فرد کو اس مصلحت سے باخبر کرنے کا قانوناً پابند نہیں تھا، جس کی بنیاد پر وہ یہ فیصلہ کر رہا ہے، اس وقت ملازمین کی کوئی مدت ملازمت معاہدے میں طے نہیں ہوتی تھی، بلکہ دونوں فریق جانتے تھے کہ اس ملازمت کا جاری رہنا یا ختم ہو جانا فریقین کے صوابدید پر موقوف ہے، اور دونوں میں سے جو چاہے کسی مہینہ یا سال کے اختتام پر ملازمت ختم کر سکتا ہے، جس کی وجوہ بیان کرنے کا بھی وہ پابند نہیں ہے، ہاں اگر سال یا مہینہ کے دوران یہ فیصلہ کیا جائے، تو ایسا فیصلہ کرنے سے پہلے دوسرے فریق کو وجوہ بیان کرنا اور اس کی بات سننا ضروری سمجھا جاتا تھا۔

اس سلسلہ میں ایک اہم مشہور واقعہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی کا ہے، حضرت خالد بن ولید جن کا شمار اسلام کے ان عظیم جرنیلوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے بے شمار معرکوں میں اپنی شجاعت، بہادری، اور حربی منصوبہ بندی کا زبردست مظاہرہ کیا۔ روم، ایران اور عراق کی فتوحات میں آپ کے کارنامے آج بھی ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان جیسے سپہ سالار کو حضرت عمر فاروقؓ نے معزول فرما دیا، ان کے خلاف کوئی بھی الزام عدالتی تحقیق کے معیار پر ثابت نہیں ہوا تھا، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں کسی جرم کی پاداش میں معزول نہیں کیا۔ بلکہ ان کی معزولی کے بعد تمام گورنرز کو ایک خط لکھا جس میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ تحریر فرمایا تھا:

"إنی لم أعزل خالدا عن سخطة ولا خیانة ، ولكن الناس فتنوا به ، فخفت أن یوكلوا إلیه ویبتلوا به فأحببت أن یعلموا أن الله

هو الصانع ، وأن لا يكونوا يعرض فتنة"۔(۱)

ترجمہ: میں نے خالد کو کسی ناراضی یا ان کی کسی خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا، لیکن لوگ ان کی (بہادری وغیرہ) کی وجہ سے فتنہ میں مبتلاء ہو رہے تھے، اور مجھے اندیشہ تھا کہ لوگ (اللہ تعالیٰ کے بجائے) ان پر بھروسہ کرنے لگیں گے، اور اس طرح غلط عقیدے میں مبتلا ہو جائیں گے، اس لئے میں نے چاہا کہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ جو کچھ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کرتا ہے، اور لوگ کسی فتنہ کا شکار نہ ہوں۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ جو کہ ایک مشہور مؤرخ ہیں، تحریر فرماتے ہیں:

"روى سيف ابن عمر أن عمر قال حين عزل خالدا عن الشام ، والمثنى بن حارثة عن العراق : إنما عزلتهما ليعلم الناس أن الله نصر الدين لا بنصرهما وأن القوة لله جميعا"۔(۲)

ترجمہ: حضرت سیف بن عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو شام سے اور مثنیٰ بن حارثہ کو عراق سے معزول کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے ان دونوں کو صرف اس لئے معزول کیا کہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ دین کو نصرت اللہ تعالیٰ کی مدد سے حاصل ہوتی ہے، اور یہ قدرت اور قوت سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے تعلقات حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اکرام و تکریم کے ہی رہے، معزولی کے بعد پہلی ملاقات ہی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا:

---

(۱) تاريخ طبرى من تاريخ الامم والملوك ط:(۱٦۷/۳)

(۲) البدايه والنهايه : ۷/ ۱۱۵ ـ ط مطبعة السعادة بجوار مصر ـ

"یا خالد! إنك علی الکریم وإنك عندی لعزیز، ولن یصل إلیك منی أمر تکرهه بعد ذلك"۔(۱)

ترجمہ: خالد! میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں اور تم مجھے بہت عزیز ہو، اور آج کے بعد میری طرف سے تمہیں کوئی ایسی بات نہیں پہنچے گی جو تمہیں ناپسند ہو۔

جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت آیا، تو انہوں نے اپنی اس آرزو کا اظہار فرمایا کہ بڑے بڑے معرکوں میں حصہ لینے کے باوجود میرا انتقال بستر پر ہو رہا ہے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے، بلکہ یہ وصیت فرمائی کہ میرے انتقال کے بعد میرے ترکہ کی تقسیم کا انتظام حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمائیں گے۔(۲)

ان تمام مذکورہ بالا حوالوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معزولی مفاد عامہ کی خاطر ہی کی تھی، نیز ان مذکورہ بالا حوالوں سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ شریعت نے مدت ملازمت کا معاملہ فریقین کی باہمی رضامندی پہ چھوڑا ہے، قرآن وسنت نے اس سلسلہ میں کوئی متعین حکم نہیں دیا، جس کی پیروی ہر حال میں لازم ہو، اگر ملازمین یہ محسوس کریں کہ ہمارے ذمہ دار حضرات خوف خدا رکھنے اور انصاف کرنے والے ہیں، تو وہ عزل ونصب کا مکمل اختیار ذمہ دار حضرات کو دے سکتے ہیں۔

اور اگر ملازمین کو اس بات کا خدشہ ہو کہ ہمارے ساتھ ناانصافی اور زیادتی ہوگی تو پھر وہ ملازمت کے تحفظ کے لئے کوئی قانون اور ضابطہ بنانا چاہیں تو وہ بھی بنا سکتے ہیں، جس کے ذریعے ملازمین کو انتظامی مصلحتوں کے پیش نظر تحفظ دیا جاسکے، ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی قرآن وسنت سے متصادم نہیں ہے۔

البتہ بعض اوقات کسی کو ملازمت پر مقرر کرتے ہوئے معاہدہ میں یہ بات طے ہو جاتی

---

(۱) حوالا بالا

(۲) الاصابة فی تمییز الصحابه: ٦ / ٤١٥

ہے کہ اس کو اتنی مدت کے لئے ملازمت پر رکھا جائے گا، اور پھر مقررہ مدت سے پہلے ہی اس کو ریٹائر کر دیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

شرعی اعتبار سے اس کا رخ متعین کرنے کے لئے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ اس طرح قبل از وقت ریٹائرمنٹ سے اس کو مجرم قرار دیا گیا ہے، یا مجرم سمجھا جا رہا ہے، یا اس کے کسی واجبی قانونی حق کا انکار کیا گیا ہے، تو ایسی صورت میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ کو اس کے خلاف فیصلہ سمجھا جائے گا، جس کے لئے اس ملازم کو صفائی کا موقع دینا لازم اور ضروری ہے، اور اگر اس کو صفائی کا موقع نہ دیا جائے، تو پھر یہ قرآن وسنت کے خلاف ہوگا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"إذا تقاضى إليك رجلان فلا تقض للأول حتى تسمع كلام الآخر"۔(۱)

ترجمہ: جب تمہارے پاس دو آدمی کوئی قضیہ لائیں تو پہلے کے حق میں اس وقت تک فیصلہ نہ کرو جب تک دوسرے کی بات نہ سن لو۔

اسی اصول کی طرف قرآن کریم نے بھی حضرت داؤد علیہ السلام کے قصہ میں اشارہ کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام عبادت فرما رہے تھے کہ اس دوران دو بھائی اپنا جھگڑا لے کر آئے، ایک بھائی نے دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میرے اس بھائی کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک دنبی ہے، لیکن یہ اس ایک دنبی کے بارے میں مجھ پر زور ڈال رہا ہے کہ وہ بھی میرے حوالے کر دو۔

یہ سن کر حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا کہ اس نے تمہاری ایک دنبی مانگ کر تم پر ظلم کیا ہے، لیکن پھر حضرت داؤد علیہ السلام کو فوراً ہی تنبہ ہوا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمایا گیا ہے، جس پر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے استغفار فرمایا۔(۲)

---

(۱) جامع ترمذی، ابواب الاحکام، حدیث نمبر: ۱۳۳۱:(۶۱۸/۳)

(۲) خلاصہ از آیت ۲۱ تا ۲۶ سورۃ: ص

ان آیات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے دوسرے بھائی کی بات سنے بغیر صرف پہلے بھائی کی بات سن کر فیصلہ فرمادیا تھا، یہ بات چونکہ عدل و انصاف اور احکام خداوندی کے خلاف تھی، اس لئے آپ کو فوراً خیال آگیا کہ یہ دونوں بھائی میری آزمائش کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجے گئے تھے، اس لئے حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی جلد بازی پر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کی۔

قرآن کریم کی ان آیات سے یہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کے خلاف کوئی جرم یا فیصلہ سنانے سے پہلے اس کو اپنا موقف بیان کرنے کا حق ملنا چاہئے، لہٰذا اگر کوئی قانون ضابطہ اس اصول کے خلاف ہو، تو وہ یقیناً قرآن و سنت سے متصادم اور شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔

اور اگر قبل از وقت ریٹائرمنٹ معاہدہ میں طے شدہ کسی شق کی وجہ سے ہے، جس کے بارے میں ملازم کو پہلے سے بتا رکھا تھا کہ اس صورت میں اس کو ریٹائر کیا جا سکے گا، تو ظاہر ہے کہ پھر قبل از وقت ریٹائرمنٹ میں کوئی قباحت نہیں ہے، کیونکہ ریٹائرمنٹ کا عمل اس کے خلاف کوئی کاروائی نہیں سمجھی جائے گی، بلکہ معاہدہ ہی کے ایک حصہ پر عملدرآمد سمجھا جائے گا۔

اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ ملازمین کے درمیان تفریق کے بارے میں قرآن وسنت نے کوئی قطعی اور ابدی حکم نہیں دیا، بلکہ اسے ہر زمانے کی مصلحتوں پر چھوڑ دیا ہے، اگر کسی زمانہ میں مسلمان کسی تفریق کو مصلحت کے مطابق سمجھیں، تو اسے اختیار کر سکتے ہیں، اور اگر مصلحت کے خلاف سمجھیں، تو اسے ترک کر سکتے ہیں، قرآن وسنت نے اسی لئے اس بارے میں کوئی ایک راہ متعین نہیں کی، جس کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان باہمی مشورے سے وہ طریقہ اختیار کر لیں، جو ان کے زمانہ اور حالات کے موافق ہو۔(۱)

---

(۱) عدالتی فیصلے : ۳۰۹

عصر حاضر میں لیزنگ کاروبار کا شرعی جائزہ

لیزنگ واجارہ کی اقسام:

لیزنگ انگریزی زبان کا لفظ ہے، عربی میں اس کو اجارہ کہا جاتا ہے، اجارہ کی دو قسمیں ہیں: (۱)......اجارۃ العمل (۲)......اجارۃ المنفعت ۔ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

"قال فی البدائع : ذکر بعض المشائخ أن الإجارة نوعان: إجارة على المنافع ، وإجارة على الأعمال"۔(۱)

اجارہ کی دو قسمیں ہیں: اجارہ علی المنافع ، اجارۃ العمل۔

اجارۃ المنفعت کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کی افادیت یا منفعت یا استعمال کا معاملہ کیا جائے، جیسے مکانات، دکانوں اور گاڑیوں وغیرہ کا کرایہ پر لین دین کرنا۔

اجارۃ العمل کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام یا عمل کے لئے اجرت کا معاملہ کیا جائے، جیسے مزدوری، ملازمت، خدمات، ٹھیکے داری، کمیشن وغیرہ۔

اجارۃ کی لغوی تعریف:

لغت میں اجارہ کا اطلاق عمل کے بدلے کسی کو کچھ عوض ادا کرنے پر ہوتا ہے:

"قال فی الشامیه:وفی اللغة الإجارة فعالة اسم للأجرة "۔(۲)

"قال فی البدائع : أما معنى الإجارة بيع المنفعة لغةً"(۳)

(۱) بدائع الصنائع:٤/١٦

(۲) رد المحتار:٨/ ٦

(۳) بدائع الصنائع :٤/١٦

اَجَرَ باب ضرب یضرب سے آتا ہے، اس کا مضارع یَاجِرُ آتا ہے یعنی کسی کے عمل کی جزاء دینا، باب مفاعلہ سے بھی آتا ہے اس وقت اسکے معنیٰ آتے ہیں باہم اجارہ کا معاملہ کرنا

اجارہ کی اصطلاحی تعریف:

شمس الائمہ علامہ سرخسی نے مبسوط میں اجارہ کی تعریف یہ لکھی ہے:

"إعلم إن الإجارة عقد على المنفعة بعوض هو مال ، والعقد على المنافع هو نوعان: أحدهما بغير عوض كالعارية والوصية بالخدمة، والآخر بعوض ، وهو الإجارة"۔ (٤)

"بے شک عقدِ اجارہ عوض یعنی مال کے بدلے میں منفعت کا عقد ہے اور منافع پر عقد کی شرعاً دو قسمیں ہیں ان میں سے ایک بغیر عوض ہے جیسا کہ عاریت اور خدمت کی وصیت کرنا اور دوسری قسم یہ ہے کہ عوض کے بدلے میں منافع پر عقد کیا جائے، اس کو اجارہ کہا جاتا ہے"۔

علامہ حصکفیؒ نے اجارہ کی تعریف یہ لکھی ہے:

"تمليك نفع مقصود من العين بعوض"۔(٥)

عوض کے بدلے میں منافع مقصودہ کے مالک بنانے کو شرعاً اجارہ کہا جاتا ہے۔

متعین عوض کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ کرتے وقت یہ طے ہونا ضروری ہے کہ عوض کتنا دیا جائے گا؟ مثلاً ایک آدمی نے ایک مکان کرایہ پر لیا، تو یہ طے کرنا ضروری ہے کہ اس کا کرایہ کتنا دیا جائے گا، اگر عوض معلوم نہ ہو، بلکہ مجہول ہو، تو جہالت کی وجہ سے اِجارہ فاسد ہو جائے گا۔ اس قید سے ہبہ، صدقہ، عاریت، قرض وغیرہ خارج ہو گئے، کیونکہ ان اشیاء کا معاوضہ نہیں ہوتا۔ یہاں اجارہ کی شرائط ارکان وغیرہ کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے، ہم یہاں

---

(٤) المبسوط: ٨٢/١٥

(٥) الدر المختار: ٦/٩

صرف بینک سے لیز پر گاڑی وغیرہ لینے کا شرعی حکم بیان کریں گے، یعنی آیا بینک سے گاڑی یا مشینری وغیرہ لیزنگ پر حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟

لیزنگ کے فوائد:

لیزنگ کاروبار، تجارت کا ایک ایسا شعبہ ہے جس کے تحت کسی صنعتی یا زرعی منصوبے یا کاروبار کیلئے مشینیں، آلات، اوزار اور گاڑیاں کرایہ پر یا قسطوں پر حاصل کی جاسکتی ہیں، دنیا کے دوسرے ملکوں میں تو یہ کاروبار کافی عرصے سے رائج ہے، البتہ پاکستان میں گزشتہ چند برسوں کے دوران اسے فروغ حاصل ہوا ہے، اگر سرمایہ کار کسی صنعتی شعبے میں سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہے، تو وہ اپنے منصوبے کیلئے اپنی پسند کا پلانٹ، مشین، آلات واوزار کسی لیزنگ کمپنی سے حاصل کرسکتا ہے، اس طرح اسے پلانٹ مشینوں آلات اوزار اور گاڑیوں کی قیمت اگر چاہے تو اسے یکمشت ادا نہیں کرنی ہوگی، بلکہ آسانی سے قسطوں پر حاصل کرسکتا ہے۔

لیزنگ کی قسمیں:

لیزنگ کی بہت ساری قسمیں ہیں مثلاً (۱) فنانس لیزنگ (۲) آپریٹنگ لیز (۳) سلیز اینڈ لیز (۴) کنٹریکٹ ہائر لیزنگ (۵) ریٹنل ہائر لیزنگ (۶) سیلز اینڈ لیز بیک

اس میں جو زیادہ رائج طریقہ ہے وہ فنانس لیزنگ ہے، اس لیز کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ لیز پر حاصل کیا جانے والا سامان لیز کی مدت گزرنے اور واجبات کی ادائیگی مکمل ہونے کے بعد استعمال کرنے والے کی ملکیت ہو جاتا ہے، مثلاً ایک شخص یا ادارے نے ایک مشین پانچ سال کی لیز پر حاصل کی، تو اسے پانچ سال کے دوران مشین کی قیمت اور لیزنگ کمپنی کے منافع کی رقم کی ادائیگی مکمل ہونے کے بعد اسے اس مشین کے حقوق ملکیت حاصل ہو جائیں گے۔

لیزنگ کا طریقہ کار:

مثلاً کوئی شخص لیزنگ کمپنی سے گاڑی لیز پر لیتا ہے، جس کی بازاری قیمت تین لاکھ

روپے ہے ، مگر لیزنگ کمپنی اس کی لیزنگ ویلیو چار لاکھ مقرر کرتی ہے ، جس کی ادائیگی چالیس اقساط میں کرنی ہوتی ہے ، فی قسط/10000 دس ہزار روپے ماہانہ کرایہ کی صورت میں ادا کرنے ہوتے ہیں ۔ گاڑی کو لیز کراتے وقت دس فیصد سیکورٹی ڈپازٹ جمع کرانا لازمی ہوتا ہے ، جو کہ تقریبا چالیس ہزار روپے بنتا ہے ، ان چالیس مہینوں کے دوران گاڑی لیزنگ کمپنی کی ہی ملکیت رہتی ہے اور جن صاحب نے گاڑی لیز پر لی ہے ، وہ اس گاڑی کو کرایہ کے طور پر استعمال کرتا ہے ۔

چار سال کے بعد جب گاڑی کی چالیس اقساط مکمل ہو جائیں گی ، تو اگر گاڑی لینے والے صاحب یہ چاہتے ہیں کہ وہ گاڑی کو اپنی ملکیت میں لے لیں ، تو جو سیکورٹی ڈیپوزٹ شروع میں جمع کروایا تھا ، وہ لیزنگ کمپنی گاڑی کی قیمت میں رکھ لے گی ، اور گاڑی اس شخص کی ملکیت ہو جائے گی ، اور اگر یہ شخص گاڑی لینا نہیں چاہتا ، تو پھر لیزنگ کمپنی گاڑی خود رکھ لے گی اور چالیس ہزار روپے اس شخص کو واپس کر دیئے جائیں گے ۔ (٦)

سیکورٹی ڈپازٹ کی حیثیت کیا ہے؟

سیکورٹی ڈپازٹ کی شرعی حیثیت کے بارے میں دو اقوال ہیں :

۱)...... یہ رقم بینک کے پاس امانت ہے ، اگر اس موقف کو اختیار کیا جائے ، تو بینک اس کے ساتھ دو طرح کا معاملہ کر سکتا ہے :

(الف) بینک یہ رقم بالکل الگ ایک طرف رکھ دے اور اسے اپنے استعمال میں نہ لائے ، مثلاً لاکرز میں رکھ دے ۔

(ب) بینک اسے کلائنٹ کے انویسمنٹ اکاونٹ میں ڈالے ، پھر مشارکہ ومضاربہ کے ذریعے تجارت کر کے حاصل شدہ نفع کا معروف متناسب حصہ کلائنٹ کو دے ، (جبکہ کنوینشل بینکوں میں ایسا نہیں ہوتا)

---

(٦) جدید معاشی نظام میں اسلامی قانون اجارہ : (ص: ٤٣١)

۲)...... دوسرا موقف یہ ہے کہ یہ رقم بینک کے پاس قرض ہے، قرض قرار دینے کی صورت میں یہ رقم بینک کی ملکیت میں آجائے گی اور بینک اسے اپنے استعمال میں لا سکے گا، اس صورت میں بینک یہ رقم کلائنٹ کے کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھ سکتا ہے۔

لیکن اس وقت یہ خرابی لازم آئے گی کہ کلائنٹ بینک کو اس شرط پر قرضہ دے رہا ہے کہ بینک اس کو گاڑی اجارہ پر دے رہا ہے، اور یہ قرض علی شرط الاجارہ ہے جو کہ شرعاً ناجائز ہے، اگر بینک کلائنٹ کو گاڑی اجارہ پر نہ دے، تو کلائنٹ ہرگز بینک کو قرضہ نہ دے گا۔

لیزنگ کا شرعی حکم اور اس کی موجودہ شرعی خرابیاں بیان کرنے سے پہلے ہم اجارہ (لیز) کے بنیادی قواعد بیان کرتے ہیں، جن کے جاننے کے بعد نفس مسئلہ کا سمجھنا آسان ہوگا۔

لیز (اجارہ) کے بنیادی قواعد

۱)...... لیزنگ ایک ایسا عقد ہے جسکے ذریعے کسی چیز کا مالک طے شدہ مدت کیلئے طے شدہ معاوضہ کے بدلے میں اس چیز کے استعمال کا حق کسی اور شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے

۲)...... لیز ایسی چیز کا ہو سکتا ہے جس کا کوئی ایسا استعمال ہو جس کی قدر و قیمت ہو، لہٰذا جس چیز کا استعمال نہ ہو، وہ لیز پر نہیں دی جا سکتی۔

۳)...... لیز کے صحیح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ لیز پر دی گئی چیز کی ملکیت موجر (لیزر) کے پاس رہے اور مستاجر کو صرف حق استعمال منتقل ہو، لہٰذا ہر ایسی چیز جسے صَرف کئے بغیر (یعنی ختم کئے بغیر یا اپنے پاس سے نکالے بغیر) استعمال نہیں کیا جا سکتا ہو، ان کی لیز بھی نہیں ہو سکتی، اس لئے نقد رقم، کھانے پینے کی اشیاء، ایندھن اور گولہ بارود وغیرہ کی لیز ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ انہیں خرچ کئے بغیر ان کا استعمال ممکن نہیں ہے، اگر اس نوعیت کی کوئی چیز لیز پر دے دی گئی، تو اسے ایک قرض سمجھا جائے گا اور قرض کے سارے احکام اس پر لاگو ہوں گے، اس غیر صحیح لیز پر بھی جو کرایہ لیا جائے گا، وہ قرض پر لیا جانے والا سود ہوگا۔

۴)...... لیز پر دی گئی جائیداد بذات خود چونکہ موجر (لیزر) کی ملکیت ہے، اس لئے

ملکیت کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذمہ داریوں کو بھی وہ خود اٹھائے گا، لیکن اس کے استعمال کے متعلق ذمہ داریوں کو مستاجر اٹھائے گا، مثلاً ''الف'' نے اپنا گھر ''ب'' کو کرایہ پر دیا، تو اس جائیداد پر عائد ٹیکس ''الف'' کے ذمے ہوں گے، جبکہ پانی کا ٹیکس، بجلی کے بل اور مکان کے استعمال کے حوالے سے دیگر اخراجات ''ب'' یعنی مستاجر پر ہوں گے۔

۵)...... لیز کی مدت کا تعین واضح طور پر ہو جانا چاہئے۔

۶)...... لیز کے معاہدے میں لیز کا جو مقصد متعین ہوا ہے، مستاجر اس اثاثے کو اس کے علاوہ اور مقصد کیلئے استعمال نہیں کر سکتا، جن مقاصد کیلئے عام حالات میں اسے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اگر اسے غیر معمولی مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے (جس کے لئے عموماً وہ چیز استعمال نہیں ہوتی) تو ایسا وہ موجر (مالک یعنی لیزر) کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتا۔

۷)...... مستاجر کی طرف سے اس چیز کے غلط استعمال یا غفلت وکوتاہی کی وجہ سے جو نقصان ہو، وہ اس کا معاوضہ دینے کا ذمہ دار ہے، لیز پر دی گئی چیز کی مدت کے دوران موجر (lessor) کے ضمان میں رہے گی، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی سبب سے نقصان ہو جائے، جو مستاجر کے اختیار سے باہر ہو، تو یہ نقصان موجر برداشت کرے گا۔

۸)...... جو جائداد دو یا زیادہ شخصوں کی ملکیت میں ہو وہ لیز پر دی جا سکتی ہے اور کرایہ مالکان کے درمیان ملکیت میں ان کے حصے کے تناسب سے تقسیم ہو گا۔

۹)...... جو شخص کسی جائیداد کی ملکیت میں شریک ہو، وہ اپنا متناسب حصہ اپنے شریک ہی کو کرایہ پر دے سکتا ہے، کسی اور شخص کو نہیں۔

۱۰)...... لیز کے صحیح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ لیز پر دی جانے والی چیز فریقین کے لئے اچھی طرح متعین ہونی چاہئے۔ مثلاً الف، ب سے کہتا ہے کہ میں تمہیں اپنی دو دکانوں میں سے ایک کرایہ پر دیتا ہوں، ''ب'' بھی اس سے اتفاق کر لیتا ہے، تو یہ اجارہ باطل ہے، الا یہ کہ دونوں دکانوں میں سے ایک کی تعیین اور شناخت ہو جائے۔ (۷)

(۷) اسلامی بینکاری کی بنیادیں: (ص: ۱۶۹)

لیزنگ کے ممنوعہ پہلوؤں کا تحقیقی جائزہ:

ہم نے پیچھے گاڑی وغیرہ لیز پر حاصل کرنے کا جو طریقہ کار لکھا ہے، اس میں شرعی اعتبار سے کئی خرابیاں ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱)...... بینک گاڑی، مشینری وغیرہ پر قبضہ کیئے بغیر آگے لیز پر دے دیتا ہے، حالانکہ شرعا خریدنے کے بعد اس پر قبضہ کرنا لازمی اور ضروری ہے۔

۲)...... اس دوران گاڑی بینک یا لیزنگ کمپنی کی ملکیت میں ہوتی ہے، لیکن ضمان میں نہیں ہوتی، حالانکہ شرعا اصول یہ ہے کہ جو چیز موجر لیز پر دے رہا ہے وہ موجر کی ضمان میں ہو، چنانچہ گاڑی کی تباہی و ہلاکت کی صورت میں نقصان بینک یا لیزنگ کمپنی کا نہیں ہوتا، بلکہ مستاجر (لیز پر لینے والے) کا ہوتا ہے۔

۳)...... تمام قسطوں کی ادائیگی کے بعد گاڑی لیز پر لینے والا شخص جب گاڑی اپنی ملکیت میں لینا چاہتا ہے، تو اس کیلئے شرعا عقد جدید ہونا ضروری ہے، جبکہ یہاں عقد جدید نہیں ہوتا، بلکہ سابقہ عقد کی بنیاد پر گاڑی اسکی ملکیت میں آجاتی ہے، جبکہ شرعا یہ ناجائز ہے۔

۴)...... گاڑی لیز پر حاصل کرتے وقت گاڑی کی انشورنس کرائی جاتی ہے جو کہ شرعا ناجائز ہے۔

۵)...... اگر قسط کو ادا کرنے میں تاخیر ہو جائے، تو تاخیر کی وجہ سے مستاجر کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے جو کہ شرعا سود اور ناجائز ہے۔

پہلی خرابی:

اب ہم ان خرابیوں کو ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں، تاکہ لیزنگ کے بارے میں ہمارا موقف واضح ہو جائے۔ پہلی خرابی بینک سے گاڑی لیز پر لینے میں یہ پائی جاتی ہے کہ بینک جو گاڑی مستاجر کو لیز پر دیتا ہے، بینک خود اس گاڑی پر قبضہ نہیں کرتا۔ شرعی طریقہ کار یہ ہے کہ پہلے بینک گاڑی کو اپنے قبضے میں لے اور پھر مستاجر کو لیز پر دے، گاڑی قبضہ کیئے بغیر لیز

پر دینا شرعاً جائز نہیں ہے، جس طرح کسی چیز کا قبضہ سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں، اسی طرح قبضہ سے پہلے کسی چیز کو کرایہ پر دینا بھی جائز نہیں ہے۔

”عن حكيم بن حزام رضي الله عنه قال قلت يا رسول الله!إني ابتاع هذه البيوع فما يحل لي منها وما يحرم علي ؟ قال يا ابن اخي!لا تبيعن شيئاحتى تقبضه،هذا إسناد حسن متصل “۔(۸)

حکیم بن حزام ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں یہ چیزیں فروخت کرتا ہوں ان میں سے کونسی میرے لئے حلال ہے اور کونسی حرام ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے میرے بھتیجے! کسی چیز کو قبضہ کرنے سے پہلے مت بیچ۔

اور ابوداؤد کی حدیث میں آتا ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”لاتبع ماليس عند ،رواه ابوداؤد وسكت عنه “۔(۹)

یعنی تم اس چیز کو مت بیچو جو تمہارے پاس نہ ہو۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جس چیز کا آدمی مالک نہ بنا ہو، یا جو چیز اس کے قبضے میں نہ آئی ہو، تو اس کی بیع درست نہیں ہے، اسی طرح اس کو اجارہ پر دینا بھی جائز نہیں ہے، اس لئے کہ جو چیز بیع کو فاسد کرتی ہے، وہ اجارہ کو بھی فاسد کر دیتی ہے۔

”لقال في الدر المختار : وتفسد الإجارة بالشروط المخالفة مقتضى العقد فكل ما أفسد البيع مما مر يفسدها “۔(۱۰)

اجارہ کو وہ شروط فاسد کر دیتی ہیں جو مقتضیٰ عقد کے خلاف ہوں، ہر وہ چیز جو بیع کو فاسد کر دیتی ہے، وہ اجارہ کو بھی فاسد کر دیتی ہے، اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ خریدار کے لئے مطلوبہ چیز خریدنے کے بعد قبضہ ہونے سے پہلے اسے آگے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اسی وجہ سے فقہاء کرام نے بیع قبل القبض کو ناجائز لکھا ہے۔

---

(۸)مصنف ابن ابی شیبہ:۵/۵۶

(۹)متن اعلاء السنن:۲/۳۶۰

(۱۰)الدرالمختار:۹/۷۷

"فقال في البزازيه: ونص في بيع الحيوان إن إجارة المبيع المنقول شائعا قبل قبضه لايجوز"۔(۱۱)

کسی چیز کو کرایہ پر دینے کا معاملہ دو طرح ممکن ہے

مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی لکھتے ہیں:

(۱) پہلی صورت یہ ہے کہ بینک اشیاء اور سامان خود خریدے اور پھر بطور مالک اس پر قبضہ بھی کرے اور پھر بینک وہ چیز مدت معلومہ اور اجرت معلومہ پر اپنے گاہک کو کرایہ پر دیدے، اس صورت میں مدت اجارہ کے ختم ہونے کے بعد وہ اشیاء اور سامان دوبارہ بینک کے قبضہ میں آجائے گا، پھر فریقین کو اختیار ہوگا چاہیں تو دوبارہ عقد جدید کرلیں، یا فریقین اس وقت آپس میں کوئی قیمت طے کر کے عقد بیع کر لیں اور بینک کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اشیاء اور سامان کو دوسرے گاہک کو کرایہ پر دیدے، یا دوسرے گاہک کو فروخت کردے، مذکورہ بالا طریقہ شرعاً بالکل جائز ہے، اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ بینک ایسی اشیاء اور سامان کرایہ پر دے جو عقد اجارہ کے وقت اس کی ملکیت میں نہیں ہے، بلکہ عقد اجارہ کرنے کے بعد وہ سامان سپلائر سے اپنے گاہک کے نام ہی پر خریدے اور بینک اپنے گاہک کو اس سامان پر قبضہ کرنے اور اس کو وصول کر کے اپنے یہاں نصب کرنے کا وکیل بنادے اور بینک ایک تاریخ مقرر کردے گا، فلاں تاریخ پر عقد بیع مکمل ہو کر عقد اجارہ شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ اس مقرر تاریخ کے بعد بینک اس چیز کا کرایہ گاہک سے وصول کرتا رہے گا، یہاں تک کہ عقد اجارہ کی مدت معاہدہ کے مطابق پوری ہو جائے، اور

(۱۱) الفتاوی البزازیہ: ۲/ ۴۱۲

بینک اپنے تمام واجبات گاہک سے وصول کرلے، تو پھر بینک وہ سامان معمولی ثمن پر اسی گاہک کے ہاتھ فروخت کردیگا۔

اس دوسری صورت میں فقہی اعتبار سے چند امور قابل غور ہیں:

(۱) جس وقت بینک عقد اجارہ کرتا ہے، وہ اس چیز کا مالک بھی نہیں ہوتا، اس پر قبضہ ہونا تو دور کی بات ہے اور جس چیز کا انسان مالک نہ ہو، اس کو کرایہ پر دینا بھی باطل ہے، اسی طرح جو چیز انسان کے قبضے میں نہ ہو، اس کو کرایہ پر دینا بھی باطل ہے، اسلئے کہ یہ "ربح مالم یضمن" کی قبیل سے ہے، جو حدیث کی رو سے ممنوع ہے

علامہ ابن قدامہ کی شرح الکبیر میں ہے:

"وكذلك لا يصح هبته ولا رهنه، ولا دفعه أجرة، وما أشبه ذلك، ولا التصرفات المنعقدة إلى القبض، لأنه غير مقبوض فلا سبيل إلى إقباضه"۔ (۱۲)

اسی طرح ہبہ، رہن، اور اجارہ اور دوسرے معاملات جو قبضہ کے ساتھ مکمل ہوتے ہیں، وہ صحیح نہیں ہیں، اس لئے کہ وہ چیز قبضہ میں نہیں ہے، لہٰذا آگے دوسرے کو اس پر قبضہ کرانا بھی ممکن نہیں ہے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

"ومنها (أي من شرائط صحة الإجارة) أن يكون مقبوض المؤجر إذا كان منقولا فإن لم يكن فيه قبضة فلا يصح إجارته"۔ (۱۳)

ترجمہ: اجارہ کے صحیح ہونے کے شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اگر وہ چیز منقول ہے تو موجر کے قبضے میں ہو، اگر وہ اس کے قبضے میں نہیں ہے، تو پھر عقد اجارہ

(۱۲) الشرح الكبير، لابن قدامه: ۴/ ۱۱۶

(۱۳) الفتاوىٰ الهنديه: ۴/ ۴۱۱

درست نہیں، شوافع کا بھی صحیح قول یہی ہے۔(۱۴)

اس مشکل کا حل یہ ہے کہ جس وقت بینک اور گاہک کے درمیان معاہدہ ہو اس وقت عقد اجارہ کو منعقد نہ مانا جائے، بلکہ اس معاہدہ کو عقد اجارہ کے لئے محض ایک وعدہ تصور کیا جائے، پھر جب گاہک سپلائر سے سامان وصول کر کے اپنے قبضے میں لے آئے اور اپنے یہاں نصب کرنے کا کام مکمل ہو جائے، اس کے بعد بینک اپنے گاہک کے ساتھ اس تاریخ پر بالمشافہ یا تحریری مراسلت کے ذریعے عقد اجارہ کرے، اور عقد اجارہ کی اس تاریخ سے پہلے وہ سامان بینک کے ضمان میں رہے گا، لہٰذا اگر اس دوران وہ سامان تباہ ہو جائے، تو بینک کا نقصان ہوگا اور اس تاریخ تک سامان پر گاہک کا قبضہ قبضہ امانت شمار ہوگا، لہٰذا اگر وہ سامان بلا تعدی کے ہلاک یا ضائع ہو جائے، تو گاہک ضامن نہیں ہوگا۔(۱۵)

دوسری خرابی:

دوسری خرابی یہ پائی جاتی ہے کہ لیز پر جو چیز دی جاتی ہے اس کا رسک (ضمان) شرعاً موجر پر آتا ہے، یعنی لیز کی مدت کے دوران وہ چیز موجر (کرایہ پر دینے والا) کے ضمان میں رہے گی، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی سبب سے نقصان ہو جائے، جو مستاجر کے اختیار سے باہر ہو تو یہ نقصان موجر (مالک) برداشت کرے گا جبکہ بینک جو گاڑی لیز پر دیتا ہے اگر اس کو نقصان پہنچ جائے تو نقصان لیز پر لینے والے کا ہوتا ہے بینک کا نقصان نہیں ہوتا۔

" ضمان العين المستاجرة تعتبر يد المستاجر على العين المستاجره فى اجارة المنافع يد امانة فلا يضمن ما يتلف بيده الا بالتعدى او التقصير فى الحفظ "۔(١٦)

---

(١٤)دیکھئے مغنی المحتاج:٢/٢٨، ٢٩

(١٥)فقهى مقالات:١/٢٧٩

سامان، مشینری، گاڑی یا اس کے علاوہ دیگر اشیاء کو کرایہ پر دینے کے بعد ایسے تمام اخراجات جو کہ معمول کے مطابق ہوں اس کو ادا کرنا مستاجر کے ذمے ہوگا اور جو اخراجات سامان کے عمل سے متعلق ہوں ان کا خرچ موجر کی ذمہ داری ہے مثال کے طور پر اگر کسی شخص نے گاڑی لیز پر حاصل کی تو اس گاڑی کے وہ تمام معمول کے اخراجات جو اس کے عمل (working) سے متعلق ہوں جیسے گاڑی کی سروس، ٹیوننگ، اور عام مرمت وغیرہ، یہ سب اخراجات مستاجر کی ذمہ داری ہوگی۔

اور اگر گاڑی کسی قدرتی آفت کا شکار ہوگئی مثلا ایکسیڈنٹ ہوگیا، گاڑی کو آگ لگ گئی، یا کسی حادثہ میں گاڑی تباہ ہوگئی تو ایسی صورت میں اس کے نقصان کی ذمہ داری موجر (مالک) کی ہوگی اور مستاجر (لیز پر لینے والا) ان نقصانات کا ذمہ دار نہ ہوگا (۱۷)

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

"اصول یہ ہے کہ اگر کرایہ کی چیز پر آفات سماویہ آجائے تو اس صورت میں مستاجر ضامن نہ ہوگا جب تک مستاجر اس میں تعدی سے کام نہ لے"۔(۱۸)

آج کل عموما اجارہ کے جو معاملات ہوتے ہیں ان میں اجارہ کی حقیقت موجود نہیں، اجارہ کی حقیقت یہ ہے کہ موجر جو مشینری وغیرہ اجارے پر دے رہا ہے، وہ اس کا مالک اور ذمہ دار ہو مگر تمویلی اجارے میں آج کل عموما ایسا نہیں ہوتا، موجر اس مشینری کی کسی قسم کی ذمہ داری نہیں لیتا اگر مشینری کا نقصان ہو جائے تو وہ مستاجر کا نقصان سمجھا جاتا ہے حتی کہ کسی حادثے میں مشینری تباہ ہو جائے تو بھی مستاجر کرایہ دیتا رہتا ہے، موجر کا تعلق اس مشینری سے صرف اتنا ہوتا ہے کہ عدم ادائیگی کی صورت میں وہ مشینری کو بیچ کر اپنا قرضہ وصول کر لیتا ہے لہٰذا آج کل عموما حقیقی اجارہ نہیں ہوتا اصل مقصد تو سود پر قرض دینا ہی ہوتا ہے مگر ٹیکس سے بچنے کیلئے اجارے کا نام دے دیا جاتا ہے، اس طرح کے معاملات شرعا جائز نہیں تاہم اگر موجر واقعی مشینری کا مالک

---

(۱۶) الفقه الاسلامی وادلته: ٦/ ٢٨٤٥

(۱۷) جدید معاشی نظام میں اسلامی قانون اجارہ: ص:۲۹٦

(۱۸) فقهی مقالات: ۱/ ۲۸۱

ہواور وہ اس کی ذمہ داری قبول کر کے اس کا اجارہ کرے تو اس کی گنجائش ہے۔(۱۹)

تیسری خرابی:

تیسری خرابی یہ پائی جاتی ہے کہ قسطوں کی ادائیگی کرنے کے بعد گاڑی لیز پر لینے والے شخص کی ملکیت میں سابقہ عقد کی بنیاد پر آ جاتی ہے عقد جدید نہیں کیا جاتا حالانکہ یہ طریقہ شرعا جائز نہیں ہے، اس کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بینکوں میں گاڑیوں اور مشینری کو لیز پر دینے کا جو طریقہ رائج ہے اسے ہائر پر چیز کہا جاتا ہے، اس میں ایک ہی عقد میں دو معاملات کو جمع کرنے کی خرابی پائی جاتی ہے جسے عربی میں صفقتان فی صفقة کہا جاتا ہے جو شرعا ناجائز ہے، حضور ﷺ نے ایسا معاملہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ مسند احمد کی روایت ہے:

"نهىٰ النبى ﷺ عن صفقتين فى صفقة واحده"۔(۲۰)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے ایک عقد کے اندر دو معاملات کرنے سے منع فرمایا ہے۔

مصنف عبد الرزاق میں عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

"لاتحل صفقة فى صفقة"۔(۲۱)

یعنی ایک معاملہ میں دو معاملے کرنا حلال نہیں ہے۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ایک عقد میں دو معاملات کو جمع کرنا جائز نہیں ہے

ہائر پر چیز کیا ہے؟

ہائر پر چیز کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو خریدنے کے لئے کرایہ پر لینا یعنی اگر کوئی شخص یا ادارہ کسی مالیاتی ادارے سے کوئی چیز کرایہ پر لے اور کرایہ کی قسطیں اس طرح مقرر کی جائیں کہ کرایہ کے ساتھ ساتھ اس کی قیمت بھی وصول ہوتی رہے تو اس عمل کو ہائر پر چیز کہا

---

(۱۹)اسلام اور جدید معیشت وتجارت:(ص:۱٤٥)ادارۃ المعارف کراچی

(۲۰)مسند احمد بن حنبلؒ:۱/ ۳۹۸۔جمع الفوائد:۲/٦٥٥

(۲۱)مصنف عبد الرزاق:۸/۱۳۹۔ط ادارۃ القرآن کراچی

جاتا ہے آج کل جو گاڑیاں بینک سے لی جاتی ہیں اسی طریقے سے حاصل کی جاتی ہیں یہ صورت دو وجوہات کی بناء پر اختیار کی جاتی ہے:

(۱) اس مشینری وغیرہ کو خریدنے سے حکومت کے ٹیکسوں میں اضافہ ہوجاتا ہے جب کہ ہائر پرچیز کی صورت میں تمام اقساط کی ادائیگی تک ٹیکس سے چھوٹ رہتی ہے۔

(۲) ہائر پرچیز پر لی گئی اشیاء عام طور پر بہت قیمتی ہوتی ہے اور ایسی صورت میں بیچنے والا شخص یا ادارے کو اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ مطلوبہ سامان بیچنے کی صورت میں اس کی ملکیت فوراً خریدار کی طرف منتقل ہوجائے گی، ہوسکتا ہے وہ اس کی اقساط کی ادائیگی بروقت نہ کرے یا بعد میں دینے ہی سے انکار کردے تو اس صورت میں بیچنے والے ادارے کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا، لہٰذا وہ اپنے لئے بہتر طریقہ یہ سمجھتے ہیں کہ فی الحال تو اس مشینری کو اجارے پر دیا جائے البتہ ان کی اقساط اس طرح پورے کی جائیں کہ اسے بیچنے کی صورت میں نفع سمیت جو کل قیمت ملتی ہے اجارہ کی مدت میں اتنی رقم مل جائے یہی وجہ ہے کہ عام طور پر ہائر پرچیز میں اجارے پر دی گئی اشیاء کی اجرت ان کی اجر مثل (بازاری قیمت) سے کچھ زیادہ ہوتی ہے اور مستاجر بھی زیادہ قیمت دینے پر اس لئے راضی ہوجاتا ہے کہ اجارہ کی مدت کی انتہاء پر یہ چیز خود بخود اس کی ملکیت میں آجاتی ہے۔(۲۲)

اس کے ناجائز ہونے کی وجہ کی صورت یہ بنتی ہے کہ زید عمر سے کہے کہ میں آپ کو یہ گاڑی اس شرط کے ساتھ لیز پر دیتا ہوں کہ اقساط مکمل ہونے کے ساتھ ہی تم اس گاڑی کے مالک بن جاؤ گے، اس صورت میں غور کرنے سے معلوم ہو کہ ایک ہی عقد کے اندر اجارہ بھی ہے اور بیع بھی ہے جو کہ شرعاً ناجائز ہے احادیث میں اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں:

فقہی اعتبار سے اس کی دو صورتیں ممکن ہے:

(۱) پہلی صورت یہ ہے کہ سامان کی بیع اجارہ کے ختم ہونے کے ساتھ معلق کردی جائے

(۲۲) غرر کی صورتیں: (ص: ۱۱۶) ط ادارۃ المعارف کراچی

اس صورت میں بیع دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہوگی، ایک یہ کہ مدت اجارہ پوری ہو جائے اور دوسرے یہ کہ مستاجر کا ذمہ تمام واجبات سے فارغ ہو جائے یہ صورت شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ اس مین بیع ہے اور بیع کا تعلق ان معاملات سے ہے جن میں تعلیق جائز نہیں اور بیع کو آئندہ کسی زمانے کی طرف منسوب کرنا بھی جائز نہیں۔

علامہ خالد اتاسیؒ شرح المجلہ میں فرماتے ہیں:

"وأما الذی لایصح تعلیقه بالشرط شرعا فضابطه کل ما کان التملیکات"۔(۲۳)

شرعاً عقود کو کسی شرط کے ساتھ معلق کرنا درست نہیں۔

دوسری صورت

عقد اجارہ کے وقت بیع نہ کی جائے، بلکہ بیع کا وعدہ کیا جائے، جس کو عقد اجارہ کے اندر بطور شرط کے مقرر کیا جائے، اس صورت میں یہ اشکال ہوتا ہے کہ یہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہے اور ان جیسی شرائط فقہائے حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک اجارہ کو فاسد کر دیتی ہیں، جب کہ فقہاء مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک بہت ساری شرائط اس میں جو مقتضائے عقد کے خلاف ہونے کے باوجود عقد کو فاسد نہیں کرتی، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ایک ہی صفقہ میں اجارہ کے اندر بیع کی شرط لگانا جائز ہوگا۔(۲۴)

مالکیہ کے دلائل ذکر کرنے کے بعد مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی لکھتے ہیں:

"مالکیہ کے قول کو اختیار کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں یہ ایک وعدہ بیع ہے جو اجارہ کے ساتھ مشروط ہے، لیکن اس صورت میں مدت اجارہ کے ختم ہونے کے بعد بیع منعقد ہوگی، لہٰذا جب مدت اجارہ ختم ہو جائے، اس وقت فریقین مستقل ایجاب وقبول کے ذریعے بیع کا معاملہ کریں، اب چاہے وہ ایجاب وقبول بالمشافہ ہو یا خط

---

(۲۳)شرح المجلة: ۱/ ٤٣٢

(٢٤)فقهي مقالات:۱/۲۸۱

وکتابت کے ذریعے ہو۔ زیر بحث مسئلہ کی ایک صورت اور بھی ہوسکتی ہے جو میرے خیال میں چاروں ائمہ کے مسلک کے مطابق درست ہوگی، وہ یہ کہ وعدہ بیع کو اجارہ کے ساتھ مشروط نہ کیا جائے، بلکہ وہ وعدہ مستقل علیحدہ کیا جائے، اس کی صورت یہ ہوگی کہ فریقین کے درمیان ایک وعدہ ایگریمنٹ میں ہوجائے جس میں اسی بات کا وعدہ ہو کہ فریقین پہلے عقد اجارہ کریں گے اور پھر بیع کریں گے اور پھر وعدہ کے مطابق وقت مقرر پر فریقین کے درمیان اجارہ ہوجائے جس میں بیع کا کوئی ذکر نہ ہو، اس کے بعد جب اجارہ کی مدت ختم ہوجائے، تو مستقل بیع کرلی جائے، جس میں کوئی شرط وغیرہ نہ ہو، اس طرح دونوں عقد مستقل اور غیر مشروط ہوجائیں گے۔ (۲۵)

اس لئے موجودہ بینکوں میں جو طریقہ رائج ہے، وہ شرعا درست نہیں ہے، ناجائز ہے، اس کا جائز طریقہ یہ ہے کہ گاڑی بینک کے ضمان میں آئے اور اس کا کرایہ مع نفع کے وصول ہوجائے، مدت اجارہ کی تکمیل پر عقد جدید کر کے بینک وہ گاڑی تاجر کو معمولی قیمت پر فروخت کردے، یا پھر اس کو ہبہ کردے۔

چوتھی خرابی:

چوتھی خرابی یہ پائی جاتی ہے کہ بینک تاجر انشورنس کی رقم لے کر گاڑی کی انشورنس کراتے ہیں، جب کہ شرعا انشورنس کرانا ناجائز اور حرام ہے، ویسے تو انشورنس کی بہت سی قسمیں ہیں، مثلا زندگی کا بیمہ، دکان کا بیمہ، انسانی اعضاء کا بیمہ، گاڑی کا بیمہ، سب کا طریقہ کار تقریبا ایک جیسا ہی ہے۔

گاڑی کا بیمہ:

مثلا زید نے دس لاکھ کی گاڑی خریدلی، اب وہ چاہتا ہے کہ گاڑی ہر قسم کے نقصانات سے محفوظ رہے، اگر اس کی گاڑی کسی حادثے میں تباہ ہوجائے، تو اس کے بدلے میں اس کی

---

(۲۵) فقہی مقالات: ۲۸۳/۱

قیمت اس کو مل جائے، تاکہ اس سے وہ دوسری گاڑی خرید سکے، اور اگر اس کی گاڑی کو کسی حادثے میں کسی قسم کا نقصان پہنچے، تو اس نقصان کی تلافی بھی ہو جائے، اس معاملے کے لئے وہ انشورنس کمپنی کے پاس جاتا ہے، کمپنی اس سے کہتی ہے کہ اگر آپ اتنی متعین رقم مثلاً چالیس ہزار سالانہ ہمیں ادا کریں، تو ہم اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ ہم آپ کی گاڑی کی ہر قسم کے نقصانات کی تلافی کریں گے، زید کمپنی سے معاملہ کر لیتا ہے، گویا وہ کمپنی کو سالانہ چالیس ہزار روپے اس شرط پر دیتا ہے کہ اگر اس کی گاڑی تباہ ہوگئی، تو کمپنی اسے دس لاکھ روپے دے گی، یا جتنا نقصان ہوگا کمپنی اسے برداشت کرے گی، یہ صورت جنرل انشورنس کی ہے۔

انشورنس کا شرعی حکم:

آج کل انشورنس کی جتنی بھی قسمیں ہیں، ان میں بنیادی طور پر تین خرابیاں پائی جاتی ہیں: (۱) دھوکہ (۲) قمار (۳) سود، ان وجوہات کی بناء پر موجودہ انشورنس کرانا شرعاً جائز نہیں ہے۔ مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی لکھتے ہیں:

"اصول یہ ہے کہ اگر کرایہ کی چیز پر آفاتِ سماویہ آ جائیں تو اس صورت میں مستاجر ضامن نہ ہوگا جب تک مستاجر اس چیز کی حفاظت میں تعدی سے کام نہ لے، اس اصول کے پیش نظر مدت اجارہ کے دوران حوادث اور آفات سے حفاظت کیلئے اس سامان کا انشورنس کرانا مستاجر کے ذمہ واجب نہیں ہے، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ اگر انشورنس کرانا ضروری ہو، تو بینک بحیثیت مالک کے اس کا انشورنس کرائے، یہ انشورنس بھی اس وقت جائز ہے جب تعاونی اور جائز انشورنس ہو، اگر وہ انشورنس دھوکہ، سود، قمار وغیرہ پر مشتمل ہو (جیسا کہ آج کل انشورنس ان چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے) ایسا انشورنس کرانا شرعاً جائز نہیں"۔ (حوالہ بالا)

مفتی کفایت اللہ دہلویؒ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

"بیمہ دراصل ربوا اور قمار سے مرکب ہے اور یہ دونوں شریعت میں حرام ہیں، اس لئے بیمہ خواہ تجارتی ہو، یا جائیداد کا، یا زندگی کا جب کہ وہ رباء اور قمار سے خالی نہیں

ہے، شرعاً حد جواز میں نہیں آسکتا"۔(۲۷)

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

"بیمہ میں سود بھی ہے اور جوا بھی ہے اور یہ دونوں چیزیں ممنوع ہیں، بیمہ میں سود تو واضح ہے کہ کم رقم قرض دے کر اس سے زیادہ وصول کیا جاتا ہے اور سود کی یہی صورت عربوں میں رائج تھی، جسکی حرمت کا اعلان قرآن مجید نے کیا"۔(۲۸)

امام جصاص لکھتے ہیں:

"والرباء الذی کانت العرب تعرفه وتفعله إنما کان قرض الدرهم والدنانیر إلی أجل بزیادة علی مقدار ما استقرض علی ما یتراضون به"(۲۹)

اور انشورنس میں قمار اسلئے ہے کہ ہوسکتا ہے کہ گاڑی کو نقصان نہ پہنچے اور نقصان پہنچنے کا بھی اندیشہ ہے، پھر یہ معلوم نہیں کہ کتنا نقصان ہوگا کم یا زیادہ یا مکمل طور پر گاڑی تباہ ہوگی، اور رقم اسلئے دی جاتی ہے کہ اس خطرے سے نمٹا جائے، یہی قمار ہے، جو نص قطعی سے حرام ہے

"قال فی الدر المختار: وسمی القمار قمارا لأن کل واحد من المقامرین ممن یجوز أن یذهب ماله إلی صاحبه ویجوز أن یستفید مال صاحبه وهو حرام بالنص"۔(۳۰)

آج کل چونکہ ہر بینک والے گاڑی کا انشورنس کراتے ہیں، جو ناجائز ہے اور گاڑی خریدنا بھی ایک ضرورت ہے، تو کیا موجودہ دور میں بے شمار خرابیوں کے باوجود ضرورت کے پیش نظر اسے اختیار کرنے کی گنجائش ہے، یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت مطہرہ میں جس ضرورت کے پائے جانے پر حرام کام

---

(۲۷) کفایت المفتی: ۹۰/۸

(۲۸) فتاویٰ محمودیه: ۲۸۷/۱۶، ط جامعه فاروقیه کراچی، طباعت ۲۰۰۸ء

(۲۹) احکام القرآن: ۶۳۵/۱ ۔ ط: قدیمی کتب خانه

(۳۰) الدر المختار: ۴۰۳/۶

کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو اردو زبان میں لفظ ضرورت کا مفہوم ہے، بلکہ شریعت کے نزدیک حرام کا ارتکاب کرنے کے لئے صرف وہ ضرورت معتبر مانی گئی ہے کہ اگر اس کا ارتکاب نہ کیا جائے تو بھوک، ننگے پن، یا بیماری کی وجہ سے جان یا کسی عضوء کے ہلاک ہونے کا خوف ہو اور اس حرام چیز کے علاوہ کوئی اور حلال چیز بھوک مٹانے، علاج کرانے یا پہننے کے لئے نہ ہو تو یہ اضطرار اور مجبوری کی حالت کہلاتی ہے، ایسی صورت میں اگر کوئی شخص اس چیز کو برا سمجھتے ہوئے اور دین کی اطاعت برقرار رکھتے ہوئے، وہ چیز بقدر ضرورت استعمال کرلے، تو شریعت میں اس کی گنجائش ہے، جیسے جان کی ہلاکت کے خوف سے صرف اتنی مقدار میں خنزیر کا گوشت کھانا جس سے جان بچ جائے جائز ہے۔

ظاہر ہے کہ انشورنس کے کاروبار میں اس درجہ کی ضرورت نہیں پائی جاتی کہ اگر اسے بند کردیا جائے، تو جان کی ہلاکت کا یا اعضاء کے تلف ہونے کا اندیشہ نہیں ہے، اس لئے نظریہ ضرورت کے تحت اسے جائز قرار نہیں دیا جاسکتا، اس لئے موجودہ انشورنس کی تمام قسمیں ناجائز اور حرام ہیں، تو گاڑی کا بیمہ کرانا بھی ناجائز اور حرام ہوگا، اور ضرورت کی بناء پر اسے جائز بھی قرار نہیں دے سکتے، اس لئے کہ یہ اس درجہ کی ضرورت نہیں ہے، جس میں حرام اشیاء کے استعمال کی اجازت قرآن مجید میں دی گئی ہے۔

پانچویں خرابی:

آج کل فنانشلز لیز کے بعض معاہدوں میں کرایہ کی ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں جرمانہ مقرر کیا جاتا ہے، جرمانہ کی یہ رقم اگر موجر کی ملکیت میں آجائے اور اس سے اس کی آمدنی میں اضافہ ہو تو یہ رقم موجر کے لئے لینا شرعاً جائز نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کرایہ مستاجر کے ذمے واجب الاداء ہوگیا تو یہ قرض بن گیا اور قرض پر اضافہ وصول کرنے سے قرآن کریم نے واضح طور پر منع کیا ہے، اور یہ سود میں داخل ہے جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ

رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴾(۳۱)

ترجمہ: پھر اگر تم اس پر عمل نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان سن لو اور اگر تم توبہ کر لو گے، تو تم کو تمہارے اصل اموال مل جائیں گے، نہ تم کسی پر ظلم کرو گیا، ورنہ تم پر کوئی ظلم ہوگا۔

اس آیت کے پیش نظر اگر مستاجر کرایہ کی ادائیگی میں تاخیر کردے، تب بھی موجر اس سے اضافی رقم کا مطالبہ نہیں کرسکتا، جبکہ موجودہ زمانے میں اگر اضافی رقم کا مطالبہ نہ کیا جائے، تو پھر بعض مستاجر وقت پر کرایہ ادا نہیں کرتے، جسکی وجہ سے موجر کو نقصان ہوتا ہے۔

اس کا متبادل:

اس سے بچنے کے لئے موجودہ زمانے میں یہ کیا جاسکتا ہے کہ مستاجر سے کہا جائے کہ وہ یہ عہد کرے کہ اگر وہ مقرر تاریخ پر کرایہ ادا کرنے سے قاصر رہا، تو وہ معینہ رقم اپنے اختیار کے طور پر صدقہ کرے گا، اس مقصد کے لئے موجر یا بینک ایک خیراتی فنڈ قائم کرسکتا ہے، جہاں اس جیسی رقوم جمع کرائی جائیں اور انہیں خیراتی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے، اس میں سے ضرورت مند لوگوں کو غیر سودی قرضے بھی دیئے جاسکتے ہیں، لیکن بہتر یہ ہے کہ یہ رقم صرف فقراء پر صدقہ کی جائے، یہ رقم تاخیر کے حساب سے مختلف بھی ہوسکتی ہے، اس کا حساب سالانہ فیصد کے حساب پر بھی کیا جاسکتا ہے، اس مقصد کے لئے لیز کے معاہدے میں اس شق کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

شق کی عبارت:

مستاجر یہ عہد کرتا ہے کہ اگر وہ کرایہ کی ادائیگی میں مقررہ تاریخ سے تاخیر کرے گا تو وہ سالانہ فیصد کے حساب سے رقم خیراتی فنڈ میں دے گا، جو موجر کے زیر انتظام ہوگا اور جسے موجر خیراتی کاموں میں استعمال کرے گا اور یہ فنڈ کسی بھی صورت موجر کی آمدنی کا حصہ نہیں ہوگا۔ یہ تجویز بعض مالکی فقہاء کے بیان کردہ ایک فقہی قاعدے پر مبنی ہے۔ مفتی رشید احمد لدھیانوی ؒ لکھتے ہیں:

(۳۱) سورۃ بقرہ آیت: ۲۷۹

"بعض علماء عصر نے اس مسئلے کے حل کے لئے یہ تجویز پیش کی ہے کہ عقد مرابحہ کرتے وقت یہ لکھوالیا جائے کہ اگر وہ ادائیگی کی اہلیت کے باوجود بروقت ادائیگی نہ کرسکا تو وہ اپنے واجب الاداء دین کا ایک مخصوص فیصد حصہ ایک خیراتی فنڈ میں چندے کے طور پر ادا کرے گا، اس غرض کے لئے بینک میں ایک خیراتی فنڈ قائم کیا جائے گا جو نہ بینک کی ملکیت ہوگا اور نہ اس کی رقوم بینک کی آمدنی میں شامل ہوں گی، بلکہ اس سے ناداروں کی امداد اور ان کو غیر سودی قرضے فراہم کرنے کا کام لیا جائے گا، بعض مالکی فقہاء کے نزدیک ایسا التزام قضاءً بھی نافذ ہوجاتا ہے، خیراتی فنڈ میں چندہ دینے کا یہ التزام اسی صورت میں ہوگا جب وہ اہلیت کے باوجود ادائیگی نہ کرے، لیکن اگر وہ واقعۃً تنگدستی کی بناء پر ادائیگی سے قاصر رہا، تو اس صورت میں خیراتی فنڈ کو چندہ دینے کا پابند نہ ہوگا"۔(۳۲)

مفتی رشید احمد لدھیانویؒ اس پر حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"مجلس کی تجویز تو یہ ہے کہ یہ فنڈ بینک کے بجائے کسی ثالث کی تحویل میں رہے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ بینک کے لئے تاخیر کی صورت میں مستاجر پر جرمانہ لگانا شرعاً سود ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، البتہ یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ ایک خیراتی فنڈ قائم کیا جائے جو بینک کی تحویل میں نہ ہو، بلکہ کسی ثالث کی تحویل میں ہو اور تاخیر کی صورت میں وہ شخص اپنا حصہ چندے کے طور پر اس ثالث کو ادا کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جتنے بھی بینک گاڑیاں لیز پر دیتے ہیں، اکثر بینکوں میں یہ خرابیاں موجود ہوتی ہیں، جو ہم نے بیان کی ہیں، اسلئے جب تک بینک ان خرابیوں کو دور نہیں کرے گا اس وقت تک بینک سے گاڑی لیز پر لینا جائز نہیں ہوگا، اگر بینک ان خرابیوں کو دور کرلے اور اجارہ کی شرائط کو مدنظر رکھ کر گاڑی لیز پر دے، تو بینک سے گاڑی لیز پر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، ہماری معلومات کے مطابق میزان بینک سے گاڑی لیز پر لینا جائز ہے۔

---

(۳۲) احسن الفتاویٰ: ۷/۱۲۰

مکتبہ عثمانیہ
اقبال مارکیٹ، اقبال روڈ، کمیٹی چوک راولپنڈی